یادگار نسیم

یعنی

مثنوی گلزارِ نسیم۔ و انتخاب دیوان

مع حواشی و تبصرۂ کلام



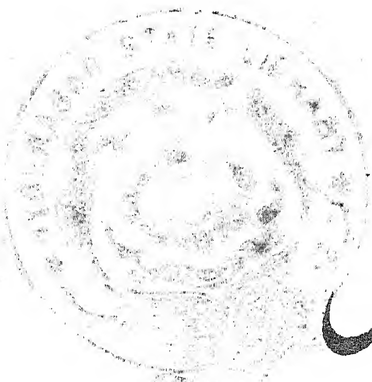
مرتبہ

مولانا اصغر حسین صاحب اصغر مصنف نشاط روح وغیرہ

انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد
۱۹۳۰ء

باہتمام کالی۔کے مترا پرنٹر و پبلشر

انڈین پریس لمیٹڈ۔ الہ آباد



التماس

۱۔ یہ ایڈیشن طلبہ کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اس لئے ایسے اشعار جو آجکل کے معیار تہذیب سے گرے ہوئے ہیں حذف کردئے گئے مگر ان کا مفہوم نثر میں لکھکر تسلسل قایم رکھا گیا ہے۔

۲۔ کوشش کی گئی ہے کہ حواشی اور فٹ نوٹ کے ذریعہ سے طلبہ کو کافی مدد مل سکے۔

۳۔ گلزار نسیم اور نسیم کی شاعری پر تبصرہ کرنے میں اسکا لحاظ خصوصیت سے رکھا گیا ہے کہ شعر و ادب کے بارے میں طلبہ کی نظر بلند ہوسکے اور ان میں صحیح بصیرت و صالح ذہنیت پیدا ہو۔

(۴) آخر میں مجھے پنڈت منوہر لال زتشی پرنسپل ٹریننگ کالج لکھنؤ کے کمال عنایات کا شکریہ ادا کرنا چاہئے جنھوں نے نہ صرف یہ کہ نسیم کے متعلق ایک وافر لٹریچر مجھے مرحمت فرمایا بلکہ مقدمہ اور فٹ نوٹ کے بارے میں بھی اپنے گرانقدر مشوروں سے میری امداد فرمائی۔

"مرتب"

م

اجتماعی

نسیم کے

نسیم کی

حاسۂ قو

حاسۂ مذ

حاسۂ اخل

مثنوی ک

سحرالبیان

گلزار نسیم

مثنوی

سحرالبیا

صحیح نہیں

فہرست مضامین

صفحہ	مضامین

مثنوی گلزار نسیم

مقدمہ

اجتماعی و انفرادی ذہنیت | جس طرح مختلف اخلاط کے باہمی امتزاج سے "مزاج" ترتیب پاتا ہے اُسی طرح افراد کی ذہنی جد و جہد اور اُس جد و جہد کی متحدہ کیفیتوں سے سوسائٹی کا مذاق بنتا اور تیار ہوتا ہے جس کے ماتحت اُس کے شعری و ادبی کارنامے بھی انجام پاتے ہیں۔ اِسی متحدہ و مشترکہ مذاق کے پردے میں سوسائٹی کی اصل روح یعنی اُس کی اجتماعی ذہنیت متمکن ہوتی ہے۔ افراد کا مذاق۔ انکا میلان طبع اُن کی شاعری بلکہ اُس شاعری کا ایک ایک لفظ اسی اجتماعی ذہنیت کی کارفرمائی اور اُسی کا ایک مخفی پرتوۂ کمال ہے۔
لیکن قدرت نے کمال حکمت سے ہر ایک کی انفرادیت کو ایک مستقل حیثیت عطا فرمائی ہے ورنہ تشخصات و تعینات قطعاً فنا ہو جاتے یہ انفرادیت جب بالکلیہ اجتماعی ذہنیت کے حلقۂ اثر میں آجاتی ہے تو اپنی انفرادیت کو گم کرکے اجتماعی ذہنیت میں محو و مدغم ہو کر رہجاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ایسی شخصیتیں جنھوں نے اپنی زبردست انفرادیت کا ثبوت دیکر کوئی مخصوص کارنمایاں کیا ہے وہ اکثر سوسائٹی کے عام ہنگامے اور اجتماعی ذہنیت کے اثرات سے دور دور رہی ہیں۔

لکھنؤ نے اپنی شاعری کے عہدِ زریں میں میر انیسؔ اور خواجہ آتشؔ سے بلند تر کوئی ہستی نہیں پیدا کی لیکن میر انیس کا سرِ مجلس یہ کہدینا کہ "صاحبو یہ میرے گھر کی زبان ہے۔ حضرات لکھنؤ اس طرح نہیں فرماتے" یا اِسی طرح خواجہ آتش کا بلاتکلف مرزا دبیرؔ کے مرثئے کو "لندھور بن سعدان کی داستان" کہدینا انفرادی ذہنیت کے بیّن آثار تھے۔ بایں ہمہ اجتماعی ذہنیت کی قوت دیکھئے کہ ان کا کلام بھی "لکھنؤ اسکول" یا اُس دور

کی عام اجتماعی ذہنیت کی مخصوص آلودگیوں سے بالکلیہ پاک نہیں۔

اجتماعی ذہنیت کے اس عام تسلط و فرمانروائی میں دیکھنے کی صرف یہ چیز رہجاتی ہے کہ کتنے اشخاص ایسے تھے جو اس عام اجتماعی ذہنیت میں گُم ہو گئے اور کتنے تھے جن کی انفرادیت باوجود اجتماعی ذہنیت کے اثرات کے پھر بھی اپنی مخصوص امتیازی حیثیت کو قائم رکھ سکی۔ انھیں آخرالذکر معدودے چند ہستیوں میں ایک ذات پنڈت دیا شنکر نسیم کول کی بھی تھی۔

نسیم کے حالات زندگی | پنڈت دیا شنکر کول نام۔ نسیم تخلص۔ لکھنؤ کے کشمیری برہمن تھے۔ سال ولادت ۱۸۱۱ء ہے۔ آپ کے والد کا نام منشی گنگا پرشاد کول تھا۔ کہا جاتا ہے کہ نسیم حضرات کشامرہ کے خلاف زیادہ وجیہ نہ تھے۔ پستہ قامت گندمی رنگ سیاہ چشم اور چھریرے بدن کے آدمی تھے عام دستور کے موافق اردو فارسی کی تعلیم عالم صغر سنی میں پائی۔ شعرائے اردو کا کلام برابر نظر سے گذرتا رہا۔ خلقی طبیعت داری و ذہانت نے شاعری کا شوق دلایا۔ خواجہ حیدر علی آتش کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا سلسلۂ معاش یہ تھا کہ شاہی فوج میں وکیل تھے۔ گلزار نسیم کو طبع و شایع ہوئے ایک سال کا زمانہ گذرا تھا کہ ہیضہ کی بیماری میں دفعتہً انتقال کیا۔ تقریباً بتیس ۳۲ سال کی عمر پائی۔ سال وفات ۱۸۴۳ء ہے۔

نسیم کی انفرادی ذہنیت

اپنے عہد کی زبان اور اپنے وقت کے طرزِ شاعری کو اختیار کرنے کے لئے قدرتاً ہر شاعر مجبور ہوتا ہے۔ اجتماعی ذہنیت (جیسا ابھی عرض کیا گیا) اُس دور میں جو

زمین تیار کر دیتی ہے اس سے یکلخت بے نیازی ایک حد تک ناممکنات سے ہے
البتہ اجتماعی ذہنیت کی اسی عام زمین پر شاعر کے انفرادی افکار جو گل بوٹے تیار
کر دیتے ہیں انھیں کے رنگ و بو سے اس کی فطرت کی آزادی اور اسکی مخصوص
شاعرانہ عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ عام طور پر انفرادی ذہنیت یا تو اجتماعی ذہنیت
میں ملکر فنا ہو جاتی ہے یا اگر وہ زندہ رہتی ہے تو اجتماعی ذہنیت سے علیحدگی کے
کچھ نہ کچھ اسباب و وجوہ کا موجود ہونا حد درجہ لازمی و ضروری ہوتا ہے۔ نسیم
کی انفرادی و شخصی آزادی کے اسباب حسب ذیل معلوم ہوتے ہیں :-

حاسۂ قومی | ا۔ نسیم کشمیری تھے۔ کشمیریوں کا عام خاصہ یہ ہے کہ وہ اپنے وقت
کے علوم و فنون اور سوسایٹی کی عام تہذیب کو بہت جلد حاصل کر لیتے ہیں۔
وہ اکثر زندہ دل۔ یار باش۔ ملنسار اور خندہ رو ہوتے ہیں۔ وہ اپنے مذہب میں
سخت ہوتے ہیں مگر اُن میں ایسا تعصب نہیں ہوتا کہ دوسری قوموں کے علوم
و فنون کی تحصیل سے انھیں باز رکھ سکے۔ عام صحبتوں میں اُنپر متعصبانہ تنگ
نظری کا کسی طرح الزام نہیں آسکتا مگر با ینہمہ ہر کشمیری اپنی قومی تہذیب و قومی
روایات کو کسی طرح ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ صدیاں گذر گئیں علم و تہذیب نے مختلف
پلٹے کھائے مگر کسی کشمیری کے گھر پر جاکے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ گو وہ ہر قسم کی
تہذیب و مذاق کا ماہر و آشنا ہے لیکن پھر بھی اس کی خانگی زندگی اپنے ایک مخصوص
قومی انداز کی حامل ہے۔ وہ زمانے کے ہر رنگ کو اختیار کر لیتا ہے مگر اُس کی اصل
زندگی کشمیری زندگی ہے جو بڑی سے بڑی قیمت پر بھی کسی دوسری تہذیب و تمدن
کے ہاتھوں ابتک فروخت نہیں ہو سکی۔ نسیم اپنے اس حاسۂ قومی کا اس طرح اظہار

کرتے ہیں ؎

نیرنگ نسیم باغ کشمیر   خوبی سے کرے دلوں کو تسخیر

حاشیہ مذہبی | ۲۔ نسیم کا عام اندازِ شاعری بالکل لکھنو کا ہے۔ وہی صنائع بدائع کا زور وہی الفاظ کی طلسم بندیاں وہی لفظی رعایتوں کی سعی جو لکھنو کے خصوصیات میں داخل ہیں صاف صاف نظر آتی ہیں۔ وہ اُس زمانہ کے عام مذاق کے موافق "قلم کو مطیع پنجتن" بھی بتاتے ہیں وہ "استخارے" کی رسم سے بھی باخبری کا ثبوت دیتے ہیں حتّٰی کہ اُنکے چند اشعار میں واقعۂ کربلا کے متعلق بھی اشارات پائے جاتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایک ہندو کو اخلاق و رواداری کے سوا ان تمام باتوں سے قدرتاً کوئی حقیقی دلچسپی نہیں ہوسکتی واقعہ یہ ہے کہ اودھ کی شاہی کتنی ہی عیش و عشرت میں غرق و سرشار رہی ہو مگر اُس نے مذہب کا صور بھی اس زور شور سے پھونکا کہ اُس کی آواز آج تک اودھ اور نواح لکھنؤ کے در و دیوار سے گونج رہی ہے۔ لہولعب۔ نشاط و تعیش کے ساتھ ذوق مذہبیت نے ایک عجیب کیفیت پیدا کردی تھی۔ شیعہ سُنّیوں میں چونکہ بہت سے عقاید مشترک ہیں اس لئے اس قسم کی اکثر باتیں ان میں بھی بہ آسانی سرایت کر گئیں۔ مثلاً مشکلکشا کا کونڈا۔ تعزیہ۔ مرثیہ۔ مجلس۔ ماتم۔ بچّوں کو محرم میں پیک اور فقیر بنانا وغیرہ وغیرہ وہ رسمیں ہیں جن میں سے اکثر از روے عقائدِ اہل سنّت جائز نہیں سمجھی جاتیں لیکن ہر طرف اسکا چرچا عام ہوگیا۔ چونکہ شعر و ادب اور اسکا مزاج ذہنی ایک بڑی حد تک سوشل نظام اور سوسائٹی کے خیالات کا تابع ہے اسلئے اسمیں بھی اس کیفیت کا پیدا ہونا لازمی تھا نتیجہ یہ ہوا کہ شیعہ سنّی سب کے سب ایک ہی نشّے میں مست اور ایک ہی رنگ میں غرق اور شرابور ہوگئے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کے

رسمیات و معتقدات کا حقیقی اثر اسلام لانے کے بعد ہے۔ نسیم نہ شیعہ تھے نہ سُنی اس لئے باوجود اس کے کہ اُنھوں نے مروجہ مذاق کی تقلید میں پوری پوری کوشش کی مگر شاعری کے اندر سے جس مذہبیت کا نفوذ عام ہو رہا تھا اس سے ہندو ہونے کے لحاظ سے اُن کی فطرت یقیناً محفوظ رہی۔ چنانچہ خیال کیا جاتا ہے کہ اُنھوں نے حمد کے شعر کو "ہر" کے لفظ سے شروع کیا جو ہندوؤں کے مذہبی اصطلاح میں خدا کا نام ہے۔ اُنھوں نے جہاں استخارے کا ذکر کیا ہے اسمیں بھی علم جوتش کی طرف اشارہ کر کے اپنی خصوصیت مذہبی کو نمایاں کر دیا ہے سے

اُس بُرج کے رُخ وہ مہ سدھارا — سیاروں سے کر کے استخارا

حاسۂ اخلاقی شعرا کی رنگین مزاجی و زندہ دلی کوئی عجیب واقعہ نہیں لیکن مہذب و شائستہ جماعت میں اُس کی آخری حد ایک ضیافت نظر و لذّت نگاہ سے زیادہ نہیں مگر لکھنؤ کا مذاق اس باب میں حد سے زائد ترقی کر گیا تھا اور شاعری و تعیش پرستی تقریباً مترادف الفاظ ہو گئے تھے یہی وجہ ہے کہ اس دور کا عام ذخیرۂ اشعا اس قابل نہیں کہ کوئی مہذّب شخص لپنے بزرگوں اپنے چھوٹوں یا گھر کی مستورات کے سامنے پیش کر سکے۔ نسیم کا مجموعۂ غزلیات اس قسم کے مضامین سے بالکلیہ پاک ہے۔ البتہ مثنوی میں کچھ تو واقعہ کے باعث اور کچھ عام مذاق کی تقلید میں عریانیٔ خیال کے موقعے پیدا ہو گئے ہیں لیکن وہاں بھی اُنھوں نے شاعرانہ حُسنِ بیان کے بہت ہی لطیف اور خوبصورت پردے ڈال دئے ہیں۔

مثنوی کی ایک اجمالی تاریخ اردو کی پہلی مثنوی قطب شاہ دکنی کی کہی جاتی ہے۔

یہ مثنوی نعت میں تھی اور سنہ ۱۰۱۸ء میں لکھی گئی اس کے بعد رستمی نے ایک مثنوی قطب شاہ کی بیٹی خدیجہ کی فرمائش سے لکھی جو منقبت میں ہے۔ اسی زمانہ میں مولانا نصرتی نے ایک عشقیہ افسانہ نظم کیا اور اس کا نام گلشن عشق رکھا پھر ایک اور مثنوی "علی نامہ" کے نام سے لکھی جس میں علی عادل شاہ فرمانروائے بیجاپور کے فتوحات اور اسکے عہد کے کارنامے نظم کئے اس کے بعد عالمگیر کے زمانہ میں خواجہ محمود بحری نے ایک مثنوی "من لگن" لکھی۔ راقم الحروف نے اسکا ایک قلمی نسخہ اپنے عزیز دوست محمد حفیظ سید اُردو لکچرار الہ آباد یونیورسٹی کے پاس دیکھا ہے اس کے مضامین ازسرتاپا متصوفانہ ہیں۔ انکے علاوہ دکن کے اور شعرا نے بھی متعدد مثنویاں لکھیں مثلاً افضل الدین خاں فضل کے نام سے بھی ایک مثنوی منسوب ہے۔ دلی میں شعرائے اردو کے دورِ اوّل میں شاہ مبارک آبرو نے متعدد مثنویاں لکھیں۔ اسی زمانہ میں حیدر بخش حیدری نے ایک مختصر سا شاہنامہ لکھا اور نظامی کی ہفت پیکر کو نظم کیا۔ اسکے بعد شاہ عالم نے اپنے عہد میں ایک شاعر کو جس کا تخلص ساقی تھا شاہنامے کو اردو نظم کا لباس پہنانے پر منتخب کیا لیکن یہ کام غالباً ناتمام رہ گیا۔ اس کے بعد میر سودا اور راسخ نے بکثرت چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھیں جو انکے کلیات میں موجود ہیں۔ اسی زمانہ میں میر اثر نے خواب و خیال کے نام سے ایک مثنوی لکھی ۔ جعفر علی خاں زکی کی جانب بھی ایک مثنوی منسوب ہے۔ میر تقی میر نے نکات الشعراء میں چند شعر اس مثنوی کے لکھے ہیں مثلاً منقبت میں یہ شعر ہے ؎

قضا کے راج کی صنعت گری دیکھ　　نبی کے آل کی بارہ دری دیکھ

عشق و آبلۂ پا کی تعریف میں لکھتے ہیں ؎

برہ کی راہ کے گوہر پھپھوے　　کہ کانٹے باٹ میں جاتے ہیں توتے

لکھنؤ اسکول کی تاسیس و تشکیل سے قبل ہی شاہانِ اودھ کی پست مذاقیوں نے شعراء کو لغویات کی جانب مائل کر دیا تھا طبیعتیں شعریت سے نا آشنا ہو کر لفظی شعبدہ پردازیوں کی جانب مائل ہوتی جا رہی تھیں اور اس طرح زبان سے کسی اعلیٰ اور حقیقی خیال کے ادا کرنے کی صلاحیت ہی رفتہ رفتہ رخصت ہو رہی تھی یہی وجہ ہے کہ انشاؔ تک نے کوئی مثنوی نہیں لکھی۔ مصحفیؔ نے البتہ بحر المحبت نامے ایک مثنوی لکھی لیکن وہ بھی میرؔ کی مثنوی "دریائے عشق" کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ اسکے بعد میر حسن کی مشہور و معروف مثنوی سحر البیان کا نمبر آتا ہے۔ اسکے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ محمد شاہی دور میں فضائل علیخاں بے قیدؔ نے خود اپنے عشق و محبت کی داستان ایک مثنوی کی شکل میں لکھی تھی جو اُس زمانہ میں بہت مشہور ہوئی میر حسن بھی اپنے تذکرہ میں اسکی بابت لکھتے ہیں:۔ مثنوی او بسیار مشہور است........ دراں مقدمہ حسب حال خود مثنوی گفتہ و بسے دُرہائے معنی سفتہ

صاحب شعر الہند لکھتے ہیں کہ اگر اردو میں کوئی مثنوی میر حسن کے لئے نمونہ و مثال کا کام دے سکتی تھی تو غالباً یہی مثنوی تھی ... بے قیدؔ نے جس عمارت کی داغ بیل ڈالی تھی اُسکے کنگروں کو اُنھوں نے اور بلند کر دیا۔

(شعر الہند حصہ دوم صفحہ ۴۷)

سحر البیان لکھنو کی مثنوی نہیں ہے

میر حسن ابتدائی شباب میں اپنے والد کے پاس دلی سے آئے تھے۔ انکا خاندان ایک مدت تک اپنی خاص زبان اور اپنے مذاق شاعری کی حفاظت کرتا آیا تھا انھوں نے مثنوی سحر البیان لکھی

لیکن اُسے لکھنؤ کی مثنوی کہنا (جیسا کہ عوام کا خیال ہے) غالباً صحیح نہ ہو۔ سحر البیان میں لکھنؤ کے مذاق ومعاشرت کی جا بجا جھلک ضرور موجود ہے لیکن میرحسن کی شاعری کی اصل زمین دلّی کی ذہنیت ہے۔ ورنہ اگر صرف اودھ کے قیام کے باعث اُسے لکھنؤ کی مثنوی کہنا صحیح ہو سکتا ہے تو سودا، میر اور مصحفی کو بھی لکھنؤ کا شاعر کہنا پڑیگا جو یقیناً کسی طرح صحیح نہیں۔ اسلئے اصلیت یہ ہے کہ لکھنؤ اسکول کا ابتدائی دور ناسخ اور آتش کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کا تمام ترکارنامہ غزل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غزل شاعری کی اعلیٰ ترین صنف ہے لیکن اُسی وقت جبکہ شاعر کی فطرت اُسکی حقیقی صلاحیت رکھتی ہو ورنہ غزل سے زیادہ لفظی گرہ بازیوں اور سطحی ہرزہ سرائیوں کا موقع کسی اور صنف شاعری میں نہیں ہے۔ غرضکہ اس دور میں کسی کو مثنوی لکھنے کا خیال پیدا نہیں ہوا اُسکی وجہ غالباً یہی ہے کہ مذاق شاعری آورد و تصنّع سے اسدرجہ گرانبار تھا کہ مسلسل خیالات کے ادا کرنے کی بعید نہیں کسی کو ہمت ہی نہ پڑتی ہو۔ مرثیوں میں بیشک مسلسل خیالات کا اظہار کیا جاتا تھا مگر ظاہر ہے کہ اسمیں ایک طرح کی بندھی ٹکی باتیں ہوتی تھیں جنہیں دور از کار اور غیر معتدل تخّیل کے زور سے تنوع پیدا کر لیا جاتا تھا حالانکہ واقعہ نگاری کے فرائض اس سے بالکل مختلف ہیں البتہ شیخ ناسخ نے نظم سراج[1] کے

---

[1] نظم سراج اس نظم کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۵۴ھ ہجری نکلتے ہیں۔ شیخ ناسخ کی تاریخ وفات بھی ۱۲۵۴ھ ہجری ہے۔ اُنکی وفات کے بعد رشک نے اس نظم کو طبع کرایا۔ گلزار نسیم کی تاریخ طبع بھی ع توقیع قبول روزبیش باد، سے ۱۲۵۴ھ ہجری نکلتی ہے نظم سراج کے چند اشعار نمونتہً آب حیات سے درج کئے جاتے ہیں۔

کی خدا نے جو یہ زبان عطا | ہے بلاشک عطیۂ عظمےٰ | اس سے ہے مختلف مزوں کی تمیز | اس سے پاتے ہیں لذت ہر چیز

کوئی کڑوی ہے کوئی ہے میٹھی | نمکیں کوئی کوئی کھٹ مٹھی | کوئی اچھی ہے کوئی زشت و زبوں | مزے سب چیز کے ہیں گوناگوں

سب مزوں سے زبان واقف ہے | انھیں اسرار کی یہ کاشف ہے | جو نہ ہو منہ تو کچھ نہ ہو معلوم | نہ ہو کوئی مزہ کبھی مفہوم

اور بھی ہوتے ہیں زباں سے کام | ہے ممد وقت بلع آب و طعام | اس سے احکام بہر دنداں ہے | قوت تام بہر دنداں ہے

نام سے ایک حدیث کا ترجمہ کیا جو بقول آزاد اُنکے مُنھ پر نہیں کھلتی اور اُسکی شاعرانہ حیثیت ع عزیز وحق تعالیٰ کبریا ہے" سے زیادہ نہیں۔ مختصر یہ کہ سحرالبیان کی تصنیف سے تقریباً نصف صدی تک لکھنؤ میں مثنوی کی جانب سے بالکل سناٹا رہا۔

گلزار نسیم لکھنؤ اسکول کی پہلی مثنوی ہے

ایسے زمانے میں نسیم نے گلزار نسیم لکھی جو نہ صرف اپنے رنگ کی پہلی مثنوی ہے بلکہ اسے لکھنؤ اور لکھنؤ اسکول کی پہلی مثنوی بھی کہنا بیجا نہ ہوگا اس مثنوی نے ایسی شہرت حاصل کی کہ ہر طرف لوگوں کو مثنوی لکھنے کا شوق و حوصلہ پیدا ہوگیا پھر تو راہ کھل گئی چنانچہ گلزار نسیم کے تصنیف و طبع کے بعد ہی تقریباً بارہ برس کے اندر اندر لکھنؤ میں متعدد مثنویاں لکھی گئیں جن میں قلق کی طلسم الفت اور نواب مرزا شوق کی زہر عشق وغیرہ مثنویوں نے کافی شہرت حاصل کی۔

سحرالبیان اور گلزار نسیم کا موازنہ صحیح نہیں

گلزار نسیم سے قبل میر حسن کی مثنوی سحرالبیان کا عام شہرہ تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ نسیم نے گلزار نسیم لکھتے وقت عمداً اُس کے رنگ سے علٰحدگی اختیار کی۔ عدم تقلید اور عام مذاق سے اجتناب ایک زبردست انفرادیت اور ایک بلند پایہ استعداد شاعری کے آثار ہیں۔ بعضوں نے میر حسن کی مثنوی سحرالبیان اور گلزار نسیم کا باہمی موازنہ کیا ہے۔ بلکہ مولانا حالی نے بھی شاید سحرالبیان ہی کو پیش نظر رکھکر گلزار نسیم پر اعتراضات کئے تھے حالانکہ مندرجہ ذیل امور کو اگر ملحوظ خاطر رکھکر غور کیا جائے تو نہ گلزار نسیم کا سحرالبیان سے موازنہ جائز معلوم ہوگا اور نہ وہ اعتراضات صحیح و مناسب سمجھے جائیں گے جو اکثر سحرالبیان کو معیار قرار دیکر گلزار نسیم پر کئے جاتے ہیں:-

(۱) نسیم نے باوجود سحرالبیان کے شہرۂ عام کے معلوم ہوتا ہے کہ اسکے طرز

سے عمداً اجتناب کیا۔ اسلئے کہ اگر تقلید و تتبع کا خیال ہوتا تو وہ شخص جس نے گلزار نسیم میں قوت نظم کا اسدرجہ حیرت انگیز ثبوت دیا ہے کم از کم دو چار مقامات پر سحر البیان کا رنگ اُڑانے میں ضرور کامیاب ہوتا۔ اور نہ کامیاب ہوتا جب بھی اُس کی اِس سعی کا صاف صاف اندازہ ہو سکتا تھا۔ لیکن دونوں مثنویوں کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے کہیں بھی طرز ادا اور انداز بیان کی مماثلت نظر نہ آئیگی۔

(۲) میر حسن نے سحر البیان میں صرف واقعہ نگاری اور جذبات کی نمائش کی کوشش کی ہے جو عام طور سے مثنوی کا حقیقی مقصد ہے برخلاف اسکے نسیم کی توجہ اپنے وقت کے طرز نظم پر بھی ہے جس میں معمولی سے معمولی بات بھی رعایت لفظی اور صنایع بدایع کی نقش طرازیوں سے خالی نہیں ہوتی تھی۔ میر حسن نے ادائے مطلب کے لئے زبان صاف سادہ اور تکلف سے خالی اختیار کی جو دہلی کے خصوصیات میں داخل ہے۔ اور میر حسن کا خاندان میر ضاحک کے وقت سے جسکی حفاظت ایک مدت تک بڑی شدت و احتیاط سے برابر کرتا آیا تھا اُسکے نصف صدی کے بعد کہ حالات بہت کچھ بدل چکے تھے اور لوگوں کے مذاق میں چند در چند اسباب کی بنا پر ایک تغیر عظیم واقع ہو گیا تھا نسیم نے گلزار نسیم لکھی اُنھوں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی جس سوسائٹی میں اُن کی تربیت ہوئی وہاں زبان اور شاعری پر اسدرجہ تکلف تصنع اور آورد کا رنگ غالب ہو گیا تھا کہ اس سے مسلسل خیالات کے اظہار کی صلاحیت ہی مفقود ہوتی جا رہی تھی نسیم نے اُسی مذاق اور اُسی طرز بیان کے ماتحت واقعہ نگاری کے فرائض ادا کرنا چاہے اس اجتہاد فکر سے زیادہ کوئی اور تعجب انگیز جسارت نہیں ہو سکتی تھی۔

(۳) میر حسن نے سحرالبیان کا اصل قصہ بھی خود ہی تصنیف کیا تھا اور اُسے اپنے شاعرانہ اغراض کے موافق جس طرح چاہا تھا ترتیب دیا تھا۔ برخلاف اس کے نسیم نے ایک ایسے قصہ کو نظم کا لباس پہنایا جو اُس سے قبل نثر میں موجود تھا۔ زبان اور طرز بیان کے مذکورہ قیود کے علاوہ واقعات کی ان مزید پابندیوں نے اس کام کو دشوار تر کر دیا تھا۔ نسیم نے قصہ کے انتخاب میں یقیناً بہت بڑی غلطی کی وہ چاہتے تو اس سے بہتر کوئی اور ہندوستانی قصہ نظم کر سکتے تھے۔ جسمیں اخلاقی نتائج اور حکیمانہ مسائل کے اظہار کا بھی موقع آسکتا تھا اور سطرح مثنوی چند شاعرانہ نکتہ سنجیوں سے ایک بلند تر چیز ثابت ہو سکتی تھی لیکن ایک بہترین آرٹ (فن جمیل) کی شرائط میں اگر یہ بات بھی داخل ہو کہ وہ اپنے زمانہ اور اپنی سوسائٹی کی تفریح و مسرت کا بھی موجب بن سکے تو شاید مثنوی کا بلند حکیمانہ مسائل پر مشتمل ہونا لکھنؤ کے اُس دور کے لئے بجائے وجہ انبساط کے شدید انقباض و بے لطفی کا باعث ہوتا۔ گلزار نسیم کی یہ ایک حیرت انگیز خصوصیت ہی کہ جس طرح وہ اپنے صنائع بدائع کے لحاظ سے اُس زمانے کے بگڑے ہوئے مذاق کا ساتھ دے سکی اُسی طرح اب تک وہ ہمارے منتخب شعری و ادبی کارناموں کا جزو لاینفک بنی ہوئی ہے۔ ضرب المثل، روزمرہ کی گفتگو، لغت کے اسناد و امثال غرضکہ اردو اور اردو ادب کی کوئی شاخ ایسی نہیں جو آج تک اس کی رہین منت نہ ہو۔

نسیم کی قوی شخصیت اور زبردست انفرادیت کا پہلا اور آخری ثبوت اُنکا بے نیاز طرز زندگی ہے۔ انکی آزادہ روی اور شان استغنا کا یہ عالم تھا کہ انکے

بعض اہل قوم نے جو اس زمانہ میں عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز اور دربار شاہی تک رسائی بھی رکھتے تھے یہ خواہش کی کہ انکو دربار شاہی تک پہنچائیں اور اُنکے منصب و جاگیر کی فکریں کریں مگر اُنھوں نے ان باتوں کی طرف مطلقاً رُخ نہیں کیا۔ اُن کی شاعری اُنکی ذاتی تفریح و دلچسپی کا نتیجہ تھی۔ اُس زمانہ کے عام دستور کے موافق وہ نہ شاعر پیشہ تھے اور نہ اس چیز کو اُنھوں نے حصول منفعت کا ذریعہ بنایا۔

کہا جاتا ہے[۱] کہ امجد علی شاہ کے سامنے ایک مرتبہ نسیم کی وہ غزل گائی گئی جس کا مطلع ہے ؎

جب نہ جیتے جی مرے کام آئیگی
کیا یہ دنیا عاقبت بخشائیگی

جب اس غزل کا مطلع گایا گیا کہ ؎

جاں نکل جائیگی تن سے اے نسیم
گل کو بوئے گل ہوا بتلائیگی

تو بادشاہ نے کہا کہ کیا یہ غزل اُسی نسیم کی ہے جو گلزار نسیم کا مصنف ہے[۲] اثبات میں جواب پاکر بادشاہ نے نسیم کو دربار میں لانے کا حکم دیا۔ حریفوں نے کہا کہ حضور نسیم کا تو انتقال ہوگیا۔ اتفاق یہ ہوا کہ اُس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد نسیم کا واقعی انتقال ہوگیا۔

---

[۱] مقدمہ گلزار نسیم از چکبست صفحہ ۳۰

[۲] " " " صفحہ ۳۰ و ۳۱

اُس دور شاعری کی تمام بندشوں کے ساتھ اس سے زیادہ کوئی اور مثنوی کامیاب نہیں لیکن جن لوگوں کے نزدیک مثنوی کا کمال صرف جذبات نگاری مصوری اور واقعہ نگاری ہے وہ یکایک گلزار نسیم کی لفظی رعایتوں کو دیکھکر گھبرا جاتے ہیں اور پھر بہ نظر امعان اسکے دیگر محاسن کی تلاش کی زحمت برداشت نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ دیگر مخالفین تو ایک طرف گلزار نسیم کے ہواخواہوں اور ثناخوانوں کے یہاں بھی "چستیٔ بندش" "تناسب الفاظ" "پختگی کلام" "شوکت الفاظ" اور "پاکیزگی زبان" ایسے رسمی الفاظ کے بعد قلم کی سیاہی خشک ہو ہوگئی ہے۔ حالانکہ اگر بہ نظر غائر اسکا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسمیں وہ تمام خوبیاں جن کا ایک مثنوی میں ہونا لازمی وضروری ہے ایک ایک کرکے موجود ہیں مگر اِن پر اُس دور کے طرز بیان کے ایسے پردے پڑے ہوئے ہیں کہ عام نظریں وہاں تک مشکل ہی سے پہونچ سکتی ہیں۔ ایک شاعر کسی تبصرہ نگار کے مقرر کردہ ابواب اور سُرخیوں کے ماتحت اپنے اشعار کے محاسن کی ترتیب و تقسیم نہیں کرتا اور اسی لئے ایسے اشعار جو صرف اُسی عنوان کے لئے موزوں ہوں دستیاب نہیں ہو سکتے ایک ہی بیان میں مختلف قسم کے محاسن شریک ہوتے ہیں اس لئے یہی ممکن ہے کہ جن اشعار میں جو محاسن زیادہ غالب نظر آئیں اُنکو اُس عنوان کے تحت میں درج کردیا جائے۔

۱ - **واقعہ نگاری و مصوّری** کسی واقعہ کے ذکر میں قطع نظر صفائی بیان کے اُس موقع اور حالت کو بھی پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ اسلئے واقعہ نگاری میں قدرتاً مصوّری کی شان موجود ہوتی ہے۔ مثلاً بکاؤلی

سلطان زین الملوک کے دربار میں بھیس بدل کر نوکری کے لئے جاتی ہے باوجود اسکے کہ وہ مردانہ لباس میں بادشاہ کے سامنے پہونچتی ہے مگر حُسن نسوانی کی نرمی و نزاکت عارض رنگیں سے صاف صاف نمایاں ہے۔ بادشاہ اُسکا حال اُس سے دریافت کرتا ہے مگر ساتھ ہی اِسکے حُسن کی رعنائیاں بھی استعجاب میں ڈالے ہوئے ہیں بکاؤلی اپنی پریشان حالی کا بہانہ کر کے بادشاہ کی ملازمت کرنا چاہتی ہے۔ تفتیش و تحقیقات میں چونکہ افشائے راز کا اندیشہ ہے اسلئے اُسکو ٹالنا بھی چاہتی ہے۔ "آدم ہر یرو۔ پری۔ کونسا گُل" سے بادشاہ کے اس استعجاب کو ظاہر کیا گیا ہے جو بکاؤلی کے حسن صورت کو دیکھ کر پیدا ہوا ہے مُ ع دی اُس نے دعا کہا بصد سوز" سے پریشان حالی کا حیلہ نمایاں ہے۔ بکاؤلی کے اختصار بیان سے بات کو ٹالنے کی سعی دکھائی گئی ہے اور بادشاہ نے چونکہ گُل کا لفظ کہکر اس کے حُسن صورت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اسلئے بکاؤلی ع "غربت زدہ کیا وطن بتاؤں" کہکر بادشاہ کے ہمدردانہ جذبات کو جنبش میں لاکر اس قسم کے طرز کلام سے اُسکو روک دینا چاہتی ہے۔ اب ان تمام باتوں کو ذہن میں محفوظ رکھکر ذیل کے اشعار کو بغور دیکھو کہ ان چند شعروں میں ان تمام حالات و واقعات کا کتنا صحیح نقشہ کھینچکر دکھایا گیا ہے۔

پوچھا اے آدم پری رو — انساں ہے پری ہے کون ہی تو؟
کیا نام ہے اور وطن کدھر ہے — ہے کون سا گُل چمن کدھر ہے؟
دی اُس نے دعا کہا بصد سوز — فرخ ہوں شہا میں ابن فیروز
گُل ہوں تو کوئی چمن بتاؤں — غربت زدہ کیا وطن بتاؤں

گھر بار سے کیا فقیر کو کام — کیا لیجئے چھوڑے گاؤں کا نام

پوچھا کہ سبب؟ کہا کہ قسمت — پوچھا کہ طلب کہا قناعت

دشت کا نقشہ

۳-ایک مصوّر جس طرح ایک چھوٹے سے کاغذ پر پنسل کی چند آڑی ترچھی لکیروں سے اونچے نیچے ٹیلے بڑے بڑے سربفلک پہاڑ اور گہری گہری گھاٹیوں کا نقشہ پیش نظر کر دیتا ہے اُسی طرح ایک باکمال شاعر چند الفاظ اور انکی ایک خاص نشست سے ذہن کو بڑے سے بڑے منظر کے تصوّر کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔ شاعری میں مصوّرانہ کمال کا یہی حصّہ سب سے زیادہ نازک اور مشکل ہے۔ شاعر اسکے لئے کبھی تو بلیغ و پُرمعنی الفاظ سے کام لیتا ہے اور کبھی تخیّل و معنی کو چھوڑ کر الفاظ کی صورت ظاہری اور مصرعوں کی ہیئت صوتی سے ذہن کے سامنے وہ منظر پیش کر دیتا ہے۔ مثلاً تاج الملوک کا گذر ایک ہولناک دشت میں ہوتا ہے، دکھانا یہ ہے کہ ایک صحرا ہے بے برگ و گیاہ، وسیع و لق و دق، جہاں کبھی کسی جاندار کا گذر نہیں ہوا۔ چاروں طرف ایک ہو کا عالم ہے اس بیان میں ساتھ کے ساتھ جو تناسب لفظی موجود ہے اُس میں عام نگاہیں اُلجھ کر رہجاتی ہیں اور عکّاسی و مصوّری کا جو کمال اس میں صرف کیا گیا ہے بادی النّظر میں معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے لفظی رعایتوں کو ذہن سے ہٹا کر ذیل کے اشعار کو پڑھو اور خط کشیدہ مصرعوں پر غور کرو ؎

اک جنگلے میں جا پڑا جہاں گرد — صحرائے عدم بھی تھا جہاں گرد

سائے کو پتا نہ تھا شجر کا — عنقا تھا نام جانور کا

مُرغانِ ہوا تھے ہوش راہی — نقشِ کفِ پا تھی ریگ ماہی

۳۔ اسی طرح ایک جگہ بکاؤلی کی ماں تاج الملوک کو پکڑ کر ایک دریائے طلسم میں ڈالدیتی ہے۔ دکھانا یہ مقصود ہے کہ بظاہر تو وہ دریا تھا مگر دراصل ایک سیمیائی فریب اور طلسمی نظر بندی تھی۔ تاج الملوک بظاہر دریا میں گر جاتا ہے مگر پھر دیکھتا یہ ہے کہ :۔

دریا تھا نہ بحر تھا نہ جیحوں   طوفانِ طلسم جوشِ افسوں
گرتے تو وہ پانی سر سے گزرا   ابھرا تو نہ کچھ نظر سے گزرا
موجوں کی عوض تھی چینِ داماں   گرداب کے بدلے تھا گریباں

ندرت تشبیہہ اور حسن بیان کے ساتھ طوفانِ طلسم۔ جوشِ افسوں اور چینِ داماں کی پختہ ترکیبوں پر نظر ڈالو۔ پھر دیکھو کہ ان تمام شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس حالت کی کتنی صحیح مصوّری کی گئی ہے۔ آخری شعر میں شانِ محاکات بھی نمایاں ہے

۴۔ شب کو جنگل میں سانپوں کے اوس چاٹنے کا نقشہ اس طرح کھتے ہیں ؎

لہرا لہرا کے اوس چاٹی   بن میں کالوں نے رات کاٹی

۵۔ صبح کے وقت جنگلی گایوں کی خوش فعلیوں کا قدرتی منظر اس طرح دکھاتے ہیں ؎

کچھ گائیں کلیلیں کر رہی تھیں   بن میں ہری دوب چر رہی تھیں

۶۔ بکاؤلی تاج الملوک کے ساتھ گرم اختلاط ہے۔ کوئی غمّاز اس کی اطلاع بکاؤلی کی ماں کو پہونچا دیتا ہے وہ یہ خبر پاتے ہی برافروختہ ہوکر اُس موقع پر پہونچتی ہے تاج الملوک کو دریائے طلسم میں ڈالدیتی ہے اور بیٹی سے

بگڑ کر کہتی ہے کہ کمبخت تو نے عزّت میں بٹہ لگادیا۔ عصمت گنوادی۔ آخر یہ کیا کیا۔ مزید تفصیلات میں حیا و شرم کا موقع آتا ہے۔ ماں بیٹیوں میں اس سے زائد گفتگو مناسب نہ تھی بالآخر سخت غصّہ کی حالت میں اسی پر اکتفا کرتی ہے کہ۔ ع

چل دور ہو میرے سامنے سے

ان تمام حالات کی کتنی سچّی تصویر ان اشعار سے نمایاں ہے ؎

وہ (یعنی بکاؤلی کی ماں) شعلۂ آتشیں لپک کے	بجلی سی گری چمک دمک کے
دونوں (یعنی تاج الملوک اور بکاؤلی) کی رہی نہ جان تن میں	کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں
شہزادے پہ اُس نے مار چنگال	دریائے طلسم میں دیا ڈال
بیٹی کی طرف کیا اشارہ	جھنجلا کے کہا کہ خام پارہ
حُرمت میں لگایا داغ تو نے	لٹوائی بہار باغ تو نے
تھمتا نہیں غصّہ تھامنے سے	چل دور ہو میرے سامنے سے

۷۔ راجہ اندر پریوں سے بکاؤلی کا حال دریافت کرتا ہے کہ وہ اس بزم رقص و سرود میں ایک مدّت سے کیوں نہیں آئی۔ پریاں کچھ خوف و ادب اور کچھ نسوانی شرم و حجاب کے باعث تاج الملوک کے تعلقات کا ذکر کرنے میں پس و پیش کرتی ہیں۔ اس موقع پر جنس لطیف کی شیرینیٔ حرکات اس طرح نمایاں کرتے ہیں ؎

مُنہ پھیر کے ایک مُسکرائی	آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی
چتون کو ملا کے رہ گئی ایک	ہونٹھوں کو ہلا کے رہ گئی ایک

۸۔ بکاؤلی کو پریاں کشاں کشاں راجہ اندر کے دربار میں لے آتی ہیں۔

بکاؤلی خوف زدہ اور سہمی ہوئی راجہ اندر کے دربار میں پہونچتی ہے۔ اُسکی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں ؎

ساتھ اُنکے (پریوں کے) وہ تابہ محفل آئی   لرزاں لرزاں مقابل آئی

۹۔ بکاؤلی ناچنے کھڑی ہوتی ہے۔ ناچ میں اس کا ٹھاٹ اس طرح دکھاتے ہیں ؎

وہ ناچنے کیا کھڑی ہوئی تھی   خود راگنی آ کھڑی ہوئی تھی

"خود راگنی کا (متمثل و متشکل ہوکر) آ کھڑا ہونا" لطافت تشبیہ کا انتہائی کمال ہے۔

۱۰۔ ایک جگہ ساز و سرود کی ہم آہنگی کی اس طرح تصویر کھینچتے ہیں کہ جس مقام پر سم ہوتا تھا حاضرین کے مُنہ سے بیساختہ "آ" کی آواز نکل جاتی تھی۔ اس سے بہتر صحیح مصوری و واقعہ نگاری اور کیا ہو سکتی ہے ؟

تھا سم پہ یہ اُس پری کا نقشہ
سب آنکھ ملا کے کہتے تھے "آ"

۱۱۔ بکاؤلی راجہ اندر کے حکم سے پتھر کی ہوگئی ہے اور کسی مٹھ میں ہے یہ خبر کچھ پریوں سے تاج الملوک کو معلوم ہوتی ہے۔ وہ اُن سے اُس مٹھ کا پتہ پوچھتا ہے۔ پریاں وہ مقام نہیں بتاتیں۔ لیکن جب یہ پریاں اپنے لباس اُتار کر ایک چشمے میں مصروف غسل ہوتی ہیں تو تاج الملوک انکا لباس کسی مقام پر لیجا کر چھپا دیتا ہے۔ اور اس طرح بکاؤلی کا جائے قیام بتانے کیلئے انھیں مجبور کرتا ہے۔ پریاں چشمے سے جب نہا کر نکلتی ہیں تو پوشاک کو غائب پاتی ہیں۔ اس حالت کا نقشہ اس طرح اُتارتے ہیں ؎

جب خوب وہ شعلہ رو نہائیں | باہر بصد آب و تاب آئیں
پوشاک دھری ہوئی نہ پائی | جانا کہ حریف نے اُڑا لی
جُھک جُھک کے بدن چُراتی آئیں | رُک رُک کے قدم بڑھاتی آئیں
دکھلائی کسی نے چشمِ جادو | چمکائی کسی نے تیغِ ابرو
جُھنجلا کے کہا کہ لاؤ مانو | ہمکو بھی بکاؤلی نہ جانو

عُریانی و برہنگی کے عالم میں قدرتی شرم و حجاب کی کتنی صحیح مصوری اس شعر میں کی گئی ہے ؎

جُھک جُھک کے بدن چُراتی آئیں | رُک رُک کے قدم بڑھاتی آئیں

صنفِ لطیف کا یہ فطری خاصہ ہے کہ گو وہ خود عشق و محبت کی بلائے لطیف میں مبتلا ہو مگر کسی دوسرے ہم جنس کی اس کمزوری کا حال معلوم کر کے اس پر طعن و طنز کرنے سے نہیں چوکتی۔ آخری شعر کو دیکھو ؎

جُھنجلا کے کہا کہ لاؤ مانو
ہمکو بھی بکاؤلی نہ جانو

اس میں جنس نازک کے اسی فطری خاصہ کی تصویر کھینچی گئی ہے۔

۱۲۔ حمّالہ کی مدد سے تاج الملوک کو پھول لانے میں کامیابی ہوئی تھی حمّالہ کی ایک مُنہ بولی لڑکی محمودہ نامی ہے۔ تاج الملوک نے حمّالہ کے احسان کے بدلے میں محمودہ سے عقد کر لیا تھا۔ یہ تمام باتیں تاج الملوک ہی کے خط سے بکاؤلی کو معلوم ہو گئیں۔ حمّالہ ان امور سے بے خبر بکاؤلی کی خدمت میں حاضر ہوتی ہے۔ بکاؤلی تجاہلِ عارفانہ کے طور پر حمّالہ سے پوچھتی ہے ؎

پوچھا کہ اری تجھے خبر ہے — گلچیں مرا کون سا بشر ہے

حمّالہ کمال عیاری سے جواب دیتی ہے ؎

وہ صدقے ہوئی کہا بلا لوں — بے دیکھے کسی کا نام کیا لوں

یہ سُنکر بکاؤلی کا پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا ہے۔ وہ یکایک برافروختہ ہو کر اُس پر برس پڑتی ہے ؎

طیش و جوشِ غضب کی تصویر کے علاوہ مستورات کی بولی ٹھولی کا نقشہ ملاحظہ ہو۔

یہ سُن کے وہ شعلہ ہو بھبھُو کا — بولی کہ تجھے لگاؤں لُوکا

تیرا ہی تو ہے فساد مُردار — داماد کو گُل دیا مجھے خار

گُل نقب کی راہ لے گیا چور — زندہ کروں اُس موئے کو در گور

واقعہ نگاری و مصوّری کے جہاں ایسے ایسے قابل قدر نمونے مثنوی میں موجود ہیں وہیں تناسبِ لفظی اور تشبیہات کی کثرت نے کہیں کہیں واقعہ اور حالت کی تصویر کو بگاڑ کر اسے مصنوعی اور غیر فطری بھی بنا دیا ہے۔ مثلاً

واں دھن کہ صنم سے کتخدا ہوں

واں جلوے حنائی اُنگلیوں کے — یاں روشنی کے تھے پنجشاخے

بادل سے وہ واں گرج رہے تھے — یاں دُھوم سے باجے بج رہے تھے

اس طرز بیان میں ابتذال بھی موجود ہے۔

۲۔ **جذبات نگاری و تحلیلِ نفسی** — واقعہ نگاری و مصوّری میں بالعموم مادّی و عرضی حالات کا نقشہ کھینچا جاتا ہے مگر کیفیاتِ مجرّدہ اور انسانی نفس کی

مخفی و نازک حالتوں کی مصوری اس سے کہیں زیادہ دشوار و مشکل ہے۔ اس حقیقت کی تصدیق تم ایک معمولی تصویر کو دیکھکر بہ آسانی کر سکتے ہو مثلاً ایک آدمی کی تصویر کھینچنا ہے تو اُسکے اعضا کا تناسب چہرے مُہرے کی صفائی۔ ناک نقشے کی خوبصورتی دکھا کر مصوری کا معمولی حق بہ آسانی ادا ہو جاتا ہے لیکن اُسی آدمی کے تیور اُسکے انداز اور اُسکی پیشانی کی شکنوں سے اگر اُسکے کیفیاتِ دلی کو بھی نمایاں کرنا مقصود ہو تو پھر فن کی حیثیت نہایت بلند اور دشوار ہو جاتی ہے انگلستان کے مشہور شاعر وُرڈس ورتھ نے کہا ہے کہ "پانی بہنے کا ترنم ایک عورت کے بُشرے میں مسرت بنکر سرایت کر جاتا ہے" اپنے نازک کیفیات و احساسات کو لفظ و بیان کے صفحات پر مرتسم کر دینا ظاہر ہے کہ فنِ لطیف کا انتہائی کمال ہے۔ مگر جب تک خود صاحبِ فن کا احساسِ لطیف و نازک نہ ہو اور اس کی طبیعت میں اتنی کافی ذکاوت و دقیقہ رسی نہ ہو کہ وہ انسانی جذبات کی پوری پوری تحلیل نفسی کر سکے اس نازک فرض سے سبکدوش و عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔ اس جگہ گلزارِ نسیم سے جذبات نگاری و تحلیل نفسی کے چند ایسے نمونے پیش کئے جاتے ہیں جن سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ نسیم کی حیثیت صرف ایک تک بند اور ناظم محض کی نہ تھی بلکہ قدرت نے اُسے نکتہ رس و فطرت شناس دل و دماغ بھی عطا فرمایا تھا۔

۱۔ مثلاً بکاؤلی کو پیام عقد دیا جاتا ہے اور تاج الملوک کی تصویر دکھا کر اسکا عندیہ لیا جاتا ہے۔ بکاؤلی چونکہ خود بھی تاج الملوک کی بغایت دلدادہ ہے اسلئے اظہارِ رضامندی کے لئے طبیعت بیقرار ہوتی ہے مگر نسوانی شرم

حجاب مانع ہے اس کیفیت کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں ؎

اقرار میں تھی جو بے حیائی شرمائی لجائی مسکرائی

جذبات و احساسات کی تصویر جیسا اوپر عرض کیا گیا ہے ایک تو یوں ہی دشوار ہے لیکن جب مرکب جذبات کے اظہار کا موقع آجائے تو یقیناً اُس کی عکاسی اور بھی دشوار ہو جاتی ہے۔ مثلاً بکاؤلی غصہ میں تاج الملوک سے پھول لیجانے کا جواب طلب کر رہی ہے اور عتاب میں لگاوٹ کے بھی آثار موجود ہیں اب اس حالت کی اصلی نزاکتوں کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل امور کو پہلے ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔

(۱) بکاؤلی کے جذبات میں عتاب و محبت کا ہیجان ہے متضاد جذبات کی باہمی کشاکش کچھ فیصلہ نہیں کرنے دیتی کہ آغاز کلام کس طرح ہو اس کیفیت کو نمایاں کرنے کے لئے "بصد تامّل" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

(۲) آخر بڑی احتیاط سے گفتگو کا آغاز ہوتا ہے جس میں محبت اور لگاوٹ کی خفیف جھلک بھی نمایاں نہیں کیجاتی بلکہ ایک تجاہل و بیگانگی کی شان موجود ہے ع کیوں جی! تمھیں لے گئے تھے وہ گُل؟

(۳) لیکن جب تاج الملوک نیچی نگاہیں کئے ہوئے اُس پر بھی خاموش رہتا ہے تو پھر کہتی ہے ؎

کیا کہتی ہوں میں اِدھر تو دیکھو! میری طرف اک نظر تو دیکھو!

(۴) آخر نگاہیں ملتی ہیں اور دوبدو گفتگو کی نوبت آتی ہے۔ اب محبت اور لگاوٹ کا جذبہ زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے لیکن "خطا" اور "سزا" کے الفاظ کا

تارِ عنکبوت اب بھی اس پر لپٹا ہوا ہے۔ آخر ایک بات کہی جاتی ہے جسمیں عتاب بھی ہے اور بیگانگی بھی لگاوٹ اور محبّت بھی ہے اور نسوانی ضبط و احتیاط بھی۔

ہے یا نہیں یہ خطا تمہاری　　فرمایئے کیا سزا تمہاری؟

یہاں پر "فرمایئے" اور "تمہاری کا" "نشترِ گریہ" اگر معین نہ ہوتا تو غالباً اتنے نازک اور اتنے متضاد کیفیات کی ترجمانی ناممکن ہو جاتی۔ اب ان اشعار کو ایک ساتھ ملاکر پڑھو اور دیکھو کہ مذکورہ تمام حالات و کیفیات کی تصویر صاف صاف نمایاں ہے یا نہیں ؎

بولی وہ پری بصد تامُّل　　کیوں جی تمھیں لیگئے تھے وہ گُل
کیا کہتی ہوں میں اِدھر تو دیکھو!　　میری طرف اک نظر تو دیکھو!
ہے یا نہیں یہ خطا تمہاری　　فرمایئے کیا سزا تمہاری

(۲) بکاؤلی زنداں خانے میں مقید ہے۔ پاسبان خواصیں سمجھاتی ہیں کہ آدم زاد سے جوناجنس ہے تعلّق اچھا نہیں۔ بکاؤلی سب کی نصیحتیں سُنتی ہے۔ لیکن عشق و محبت کا خاصہ ہے کہ شدائد و مصائب کے موقع پر اور ترقی کر جاتا ہے۔ اسوقت مصلحت بینیوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ جانبازی۔ اذیت کوشی اور سوختہ جانی کے لئے طبیعت آمادہ رہتی ہے۔ اور نصیحتیں زہر معلوم ہونے لگتی ہیں۔ فطرتِ انسانی کے اس خاصہ کو بکاؤلی کی زبان سے اسطرح ادا کرتے ہیں ؎

جھنجلائی بکاؤلی کہ بس بس　　اب ایک کہو گی تم تو میں دس
رنجور جو ہوں تو میں تمھیں کیا　　مجبور جو ہوں تو میں تمھیں کیا
مانا مری حالت اب روی ہے　　بہتر ہے وہی جو کچھ بدی ہے

اتنے صاف اشعار کے ساتھ جن میں ایک خاص انسانی جذبہ کی مصوّری کی جارہی ہو۔ "بہتر" اور "بد" کی صنعت تضاد بھی برابر برابر لگی لپٹی چلی جارہی ہے۔ اسی چیز کے باعث جذبات نگاری کے بعض نہایت اچھے موقعے برباد ہو گئے ہیں مثلاً بکاؤلی کے صدمۂ مفارقت کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں ؎

کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں
آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں
صدمے سے جو زندگی کے تھی تنگ
کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ

ممکن ہے کہ بعضوں کے نزدیک یہ طرز بیان نہایت پسندیدہ ہو مگر انصاف یہ ہے کہ جذبات نگاری کا یہ ایک خاص موقع تھا جہاں اس قسم کی لفظی شعبدہ پردازیوں سے اگر کام نہ لیا جاتا تو فطری کیفیات کا نقشہ اس سے بہتر تیار ہو سکتا تھا۔

رمز واشارہ واقعہ نگاری و تحلیل نفسی ہی کے سلسلے میں ایک امر یہ بھی ہے کہ کہیں کہیں اشارات وکنایات سے بھی کام لیا جائے۔ یہ موقع کسی افسانۂ محبت میں بالعموم اُسوقت آتا ہے کہ افسانے کے کیریکٹر کسی ناگفتنی واقعہ کو نہایت نازک اور لطیف طور پر اخفا یا افشا کرنے پر آمادہ ہو گئے ہوں۔ مثلاً تاج الملوک شب کو چھپ کر راجہ اندر کی محفل میں گیا تھا وہاں اُس نے بکاؤلی کا آگ میں ڈالا جانا اُس کا محفل میں ناچنا سب کچھ دیکھا تھا۔ اسی سلسلے میں خود کھاوجی بنکر نولکھا ہار جو بکاؤلی کو انعام میں ملا تھا لے لیا تھا اور پھر چپکے سے واپس آگیا تھا ان تمام امور کی بکاؤلی کو خبر نہیں ہے۔ صبح کو وہ بکاؤلی کو دیکھ دیکھ کر مسکراتا ہے

بکاؤلی اس مُسکرانے کو پُر معنی سمجھتی ہے اور مُسکرانے کا سبب دریافت کرتی ہے۔ تاج الملوک کہتا ہے کہ میں نے شب کو ایک خواب دیکھا ہے۔ خواب کو اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ کنایۃً شب کے تمام واقعات اس سلسلہ میں آجاتے ہیں۔ بکاؤلی اس کی تاویل کرتی ہے۔ اس مقام پر تاج الملوک کے اشارات اور بکاؤلی کی تاویل میں شاعر کا کمالِ فن ملاحظہ ہو ؎

جب پردۂ صبح ہو گیا فاش — خنداں خنداں اُٹھا وہ بشّاش
اُس غنچہ دہن کا مُسکرانا — بے رنگ بکاؤلی نے جانا
ہنسنے ہنستے کہا ہنسے کیوں — ہنستا نہیں بے سبب کوئی یوں
بولا وہ کہ خواب دیکھتا تھا — آتش پہ کباب دیکھتا تھا
بولی وہ کہ ہم بتائیں تعبیر — دلسوزی کریگا کوئی دلگیر
بولا وہ کہ رات میں اُفق میں — خورشید تھا آتشِ شفق میں
بولی وہ کہ مِہر سے شب و روز — عالم میں رہو گے رونق افروز
بولا وہ کہ اک مقام ہو تھا — گلزارِ خلیل رو بہ رو تھا
بولی وہ بشر رہو تم دلاور — سر سبز ہو قوم آتشی پر
بولا وہ کہ دیکھی اک شبستاں — شعلہ ہوا انجمن میں رقصاں
بولی وہ کہ شعلہ میں پری ہوں — جو ناچ نچاؤ ناچتی ہوں
بولا وہ کہ جب ہوا اُجالا — بخشا مہِ انجمن نے ہالا

۲۔ اوّل اوّل اشتیاق ملاقات میں طرفین کو یہ اندیشہ رہتا ہے۔ کہ کہیں یہ بات خلاف مزاج نہ ہو اسلئے بالعموم عرض تمنا کی تمہید میں ابہام۔

ذو معنی بلکہ ابہام سے کام لیا جاتا ہے تاکہ اگر مخاطب کو یہ بات ناگوار معلوم ہو تو فوراً پہلو بدل کر اس کی کوئی خوبصورت اور سنجیدہ تاویل کر دیجائے۔ مثلاً تاج الملوک حمالہ کے یہاں مہمان ہے۔ حمالہ کی دختر محمودا باوجود اشتیاق و محبت کے تاج الملوک کے توجہات سے تمام شب محروم رہی ہے۔ صبح کو تاج الملوک باغ و چمن کی دلفریبی اور ہوائے سرد کی لطافتوں کا ذکر کرتا ہے

بولا وہ فسردہ دل سحر گاہ　　کیا سرد ہوا ہے واہ واہ واہ

محمودا اسی سلسلۂ گفتگو کی آڑ لیکر اس طرح اپنی لگاوٹ کا اظہار کرتی ہے ؎

بولی وہ کہ ہونے کو ہوا ہے　　جو غنچہ کو گل کرے صبا ہے

مطلب یہ ہے کہ "میرے دل کی کلی کھلے" تو میں سمجھوں کہ ہوا ہے۔ تاج الملوک اس کنایہ کو سمجھتا ہے اور اُسی "پھول" اور "ہوا" کے پردۂ بیان میں یہ اشارہ کرتا ہے کہ اگر مجھے تیری کوششوں سے گلِ بکاؤلی مل گیا تو میں ابھی ہوا ہوں ؎

بولا وہ یہی تو چاہتا ہوں　　گل پاؤں تو میں ابھی ہوا ہوں

اس "ہوا ہوں" میں ایک پہلو یہ ہے کہ میں تجھ سے عقد کر لوں دوسرا پہلو یہ ہے کہ میں ابھی روانہ ہو جاؤں" یہ فقرے تمام ذو معنی ہیں محمودہ نے جسطرح غنچۂ دل کے کھلنے کے لئے ہوا کی خواہش کی تھی اُسی طرح تاج الملوک نے بھی کنایۃً وعدہ کر لیا کہ "میں ابھی ہوا ہوں"

۳۔ "حسن آرا" بکاؤلی کی ماں کے پاس تاج الملوک کا پیام عقد لیجاتی ہے۔ باتوں ہی باتوں میں یہ اشارہ کرتی ہے کہ لڑکی (یعنی بکاؤلی) اب جوان ہو گئی ہے۔ اسکا دل تاج الملوک پر آیا ہوا ہے۔ اب زائد روک تھام

مناسب نہیں ورنہ اندیشہ ناک صورتیں پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ صرف ایک
شعر سے جسمیں تمام مذکورہ امور کے کنایات موجود ہیں حسن آرا کی زبان سے
اس طرح ظاہر کرتے ہیں ؎

بھریئے وہیں تک نہ چھلکے جسمیں　　واجب نہیں اب تامّل اسمیں

ایجاز و اختصار:۔ گلزار نسیم کا سب سے بڑا طغرائے امتیاز اسکا ایجاز و اختصار ہے
بعض جگہ بہت بڑے بڑے واقعات و مطالب کو اس درجہ مختصر طور پر بیان کر دیا
ہے کہ اُس سے کسی اور بہتر طریق کا تصوّر بھی ذہن میں نہیں آسکتا۔ دلبر بیسوا
بادشاہ زین الملوک سے وہ تمام واقعات جو تاج الملوک اور اُس کے بھائیوں
کو پیش آئے تھے بیان کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان سب کی تفصیل کیجاتی
تو یہ مقام کسی قدر بے لطف و بے کیف ہو جاتا۔ اسلئے ایک ایک مصرعہ
میں کئی کئی واقعات کو انتہائی اختصار و خوبی سے بیان کر دیا ہے۔ جُوا کھیلنے
کے واقعہ سے لیکر تاج الملوک کی آخری کامیابی یعنی گلشن نگاریں کی تعمیر
تک کے واقعات کسقدر طولانی ہیں۔ مگر ان سب کو چند اشعار میں لکھکر
فن نظم کا کتنا بڑا کمال نمایاں کرتے ہیں۔

وہ جیل، وہ ہار، وہ غلامی　　وہ گھات، وہ جیتنا تمامی،
وہ دسترس اور وہ پائمردی　　وہ بیکسی، اور وہ دشت گردی،
وہ دیو کی بھوک اور وہ تقریر،　　وہ حلوے کی چاٹ اور وہ تحریر،
وہ سعی، وہ دیونی کی صحبت،　　محمودہ کی وہ آدمیت،
تجویز کے وہ سرنگ کی راہ　　اور ہوش دوانیاں وہ دلخواہ

وہ سیرِ چمن، وہ پھول لینا — وہ عزم وطن، وہ داغ دینا
وہ کور کے حق میں خضر ہونا — وہ غول سے مل کے پھول کھونا
وہ بال کو آگ پر دکھانا — وعدے پہ وہ دیونی کا آنا
وہ نزہتِ گلشنِ نگاریں — وہ دعوتِ بادشاہ وہ تمکیں
گذرا تھا جو کچھ بیاں کیا سب — پنہاں تھا جو کچھ عیاں کیا سب

۲۔ صحرائے طلسم میں تاج الملوک نے ایک اژدھا دیکھا۔ اژدھے کے مُنہ سے ایک کالا سانپ نکلا۔ کالے سانپ نے مُنہ سے من نکالا صبح کو پھر بدستور کالے نے من کو مُنہ میں لے لیا اور کالے سانپ کو اژدھے نے مُنہ میں رکھ لیا آخری واقعہ کو دو مصرعوں میں اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

جب صبح ہوئی تو مُنہ میں ڈالا
کالے نے من، اژدھے نے کالا

۳۔ ایک طائر کی ہدایت کے موافق تاج الملوک ایک حوض میں کود پڑتا ہے۔ طائر ہی کے حسب بیان وہ طوطا بن جاتا ہے۔ طوطا بنکر ایک شجر پر پہونچتا ہے۔ اُس شجر کا پھل کھا کر پھر انسان کی شکل اختیار کرتا ہے انسان بنکر اُس درخت کے پتّے اسکا پھل گوند اور چھال لے کر روانہ ہوتا ہے۔ ان تمام واقعات کو دو شعروں میں اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

طوطا بن کر شجر پہ آ کر — پھل کھا کے بشر کا روپ پا کر
پتّے پھل گوند چھال لکڑی — اُس پیڑ سے لے کے راہ پکڑی

اسی طرح کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو ؎

گھوڑا، جوڑا، نفر، حویلی   جو جو شے چاہئے تھی ے لی

۴۔ تاج الملوک کا باپ معہ حشم و خدم کے تاج الملوک سے گلشن نگاریں میں ملنے آتا ہے۔ ابھی تک تاج الملوک کے باپ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ تاج الملوک اُسی کا فرزند ہے۔ تاج الملوک کو باپ کے آنے کی خبر ملتی ہے۔ وہ تا درِ خانہ "پیشوائی" کرتا ہے۔ بادشاہ کے مصاحب و افسر بھی ساتھ ہیں۔ سب ایوان جواہر میں پہونچتے ہیں۔ انکے تواضع و تکریم کے ذکر میں واقعہ نگاری و مصوری کے ساتھ اختصار بیان کا لطف ملاحظہ ہو ؎

وہ چتر کے زیر سایہ بیٹھے   افسر سب پایہ پایہ بیٹھے
جو جو کہ تواضعات ہیں عام   لے آئے خواصِ نازک اندام
چکنی ڈلی عطر الائچی پان   نقل و مے و جام و خوانِ الوان
رغبت سے انھیں کھلا پلا کے   بولا شہزادہ مسکرا کے

۵۔ باتوں ہی باتوں میں تاج الملوک کا ذکر آتا ہے۔ تاج الملوک خود تجاہل عارفانہ کے طور پر باپ سے کہتا ہے کہ حضور والا آپ کے یہاں کوئی شخص تاج الملوک کی صورت بھی پہچانتا ہے یا نہیں؟ اس دریافت پر تاج الملوک کا کوکا جو بادشاہ کے ساتھ ہے تاج الملوک کو پہچان لیتا ہے، اور بادشاہ سے کہتا ہے کہ مجھے تو یہ شاہزادہ تاج الملوک معلوم ہوتا ہے لطف زبان کے ساتھ اختصار بیان ملاحظہ ہو ؎

اک اُن میں سے چشم آشنا تھا   کوکا اُسی شاہزادے کا تھا
بولا کہ حضور ادھر تو دیکھیں   دیکھا تو کہا۔ مری نظر میں

صورت وہی رنگ روہی ہے　　لہجہ وہی گفتگو وہی ہے

۶۔ گلشن نگارین کی تعمیر کے وقت تاج الملوک نے حمالہ کو بلوایا۔ وہ آئی تو ؎

تنہا اُسے دیکھ کر کہا ہیں　　محمودا کیا ہوئیں کہا ہیں

اس میں اختصار کے ساتھ زبان کا بھی کسقدر لطف ہے۔ اختصارِ بیان جیسا اوپر عرض کیا گیا گلزارِ نسیم کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔ اور جس عمدگی و صحیح تناسب کے ساتھ اس سے کام لیا گیا ہے۔ اس کی مثال کسی دوسری مثنوی میں بمشکل ہی مل سکتی ہے۔ لیکن اختصار نے بعض مقامات پر بیان کو بے لطف بنا کر عیب بھی پیدا کر دیا ہے۔ مثلاً بکاؤلی اور تاج الملوک کی شادی کا تذکرہ نہایت تفصیل سے لکھتے ہیں۔ بارات کی دھوم دھام کا نقشہ طوالت کے ساتھ بیان کرتے ہیں مگر جب دعوت کا ذکر آتا ہے تو صرف ایک شعر پر اکتفا کرتے ہیں ؎

گل سے خوانوں میں زردہ آیا　　اُن غنچہ دہانوں کو کھلایا

یہاں نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ زردہ کی کیا خصوصیت تھی اور نہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ کس نے اور کن غنچہ دہانوں کو کھلایا۔ یہ اختصار اس درجہ بے محل اور مبہم ہے کہ معلوم ہوتا ہے گویا یہاں سے کچھ اشعار نکل گئے ہیں۔ عام روایت یہ ہے کہ نسیم نے یہ مثنوی نہایت ضخیم لکھی تھی لیکن خواجہ آتش کے ایما سے مختصر کر دی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی شدتِ اختصار نے بعض مقامات پر اس قسم کے عیوب پیدا کر دئے۔

تشبیہ و تمثیل شعر و شاعری کا بہت بڑا سرمایہ تشبیہ و تمثیل پر مشتمل ہے۔
شاعری ہی پر کیا موقوف ہے وہ لوگ جنکو شعر و ادب میں مطلقاً کوئی دخل
نہیں ہوتا وہ بھی نادانستہ طور پر اپنے بیان میں برابر تشبیہ و تمثیل سے کام لیا کرتے ہیں
اسلئے ایک خوش مذاق شاعر کا کمال فن صرف تشبیہ و تمثیل کے استعمال میں نہیں
بلکہ اُس کا اصلی طغرائے امتیاز تمثیل و تشبیہ کی لطافت و جدت اور اُسکی گہری معنویت
پر منحصر ہے۔ مشہور ہے کہ کسی بادشاہ نے اپنے لڑکے کو علم نجوم کی تعلیم دلوائی۔ وہ
جب تحصیل علم سے فارغ ہوا تو ایک دن اُسکا امتحان لیا گیا کسی شخص نے مُٹھی میں
ایک انگوٹھی لیکر شاہزادے سے دریافت کیا کہ اس میں کیا ہے۔ شاہزادے
نے اپنے علم کی مدد سے پہلے یہ بتایا کہ کوئی گول گول چیز ہے۔ انگوٹھی میں چونکہ
نگینہ بھی جڑا ہوا تھا اسلئے یہ بھی بتایا کہ کچھ پتھر کی قسم سے ہے۔ یہ دونوں باتیں اپنی
اپنی جگہ پر صحیح تھیں لیکن جب پھر دریافت کیا گیا کہ آخر ان تمام باتوں سے نتیجہ
نکال کر یہ تو بتایئے کہ مُٹھی میں ہے کیا تو شاہزادے صاحب نے کمال فراست
و دانائی سے جواب دیا کہ "چکّی کا پاٹ ہے"۔ تشبیہ و تمثیل یا استعارے میں بھی ایک
صحیح الذوق شاعر کا فرض فقط یہ نہیں ہے کہ وہ تشبیہ و تمثیل یا استعارے کو
صرف استعمال کر دے۔ یہ بھی نہیں کہ صرف اُنکے قریب الماخذ ہونے کا لحاظ
رکھے بلکہ اگر اُسمیں لطافت و جدّت اور کوئی مخصوص معنوی خوبی پیدا نہ کر سکا تو
اُس کی یہ تمام جانکاہیاں فضول لغو مہمل و بیکار کہلائینگی۔ یوں تو ذیل کے اشعار
میں بھی تشبیہ و تمثیل موجود ہے ناسخ ؎

استرے سے کردئے ابروئے جاناں کیا درست ۔۔۔ مرتبہ حاصل ہوا حجّام کو محرّاب کا

دیکھکر تجھکو نہ کیوں نعرہ زن ہوں سب رقیب — بیشتر کتوں کو بھنکواتا ہے جلوہ ماہ کا

مجھکو سودائی بنایا ہے دکھا کر آنکھیں — تم وصنوبرے کا لیا کرتے ہو بادام سے کام

مجھسے ہلواتا ہے لیزم اب جنوں زنجیر کی — اور کوہ عشق کی کہتا ہے تو مگدر اُٹھا

اگر مطلقاً تشبیہ و تمثیل ہی قابل تعریف شے ہو تو "زنجیر کی لیزم" اور کوہ عشق کی "مگدر میں بھی کافی تشبیہ و تمثیل کا حق ادا کیا گیا ہے مگر کون خوش مذاق شخص ایک لمحے یا ایک وقفے کے لئے بھی اس قسم کی "تشبیہ و تمثیل" کو گوارا کر سکتا ہے۔ تشبیہ و تمثیل (جیسا کہیں اوپر عرض کیا گیا) نسیم کے عہد میں بیحد رائج تھی۔ حتیٰ کہ بازاری لوگوں میں بھی خوش طبعی کے سلسلہ میں "پھبتی" کے نام سے جو چیز رائج تھی (اور شاید اب بھی ہے) وہ بھی اسی طرح سے تشبیہ و تمثیل ہی کی ایک قسم ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ تشبیہ و تمثیل یا استعارہ) جسے ایک روشن جان اور لطافت پسند شاعر اپنے ادائے مطلب کے لئے منتخب کرے گا وہ اس قسم کی بازاری و مبتذل تشبیہ و تمثیل سے بالکل مختلف ہوگی۔ چنانچہ گلزار نسیم سے اس طرح کی چند نادر مثالیں یہاں نمونۃً پیش کیجاتی ہیں:۔

۱۔ مثلاً دیو اپنے بھائی کو ایک ٹیکرے پر کھڑے ہو کر بلاتا ہے۔ اس کے پکارنے کے ساتھ ہی اُسکا بھائی آموجود ہوتا ہے قوی ہیکل دیو کے آنے اور اس سرعت سے آنے کو "صدائے کوہ" سے تشبیہ دیتے ہیں جس میں عجلت اور جسامت دونوں چیزوں کا تخیل موجود ہے ؎

اک ٹیکرے پر گیا بلایا
وہ مثل صدائے کوہ آیا

۲۔ حمالہ کے گھر میں محمودا کے ہونے کو اس طرح لکھتے ہیں ؎

اُس دیونی پاس ایک حسیں تھی
زنبور کے گھر میں انگبیں تھی

۳۔ بکاؤلی کے صدمۂ مفارقت کے ذکر پر کہتے ہیں ؎

صورت میں خیال رہ گئی وہ
ہیئت میں مثال رہ گئی وہ
آنے لگے بیٹھے بیٹھے چکر
فانوس خیال بن گیا سر

۴۔ ؎ پریوں نے ہوا سے تخت اُتارا
ثابت ہوا ٹوٹتا ستارا

"ثابت" و "ستارے" میں تناسب لفظی بھی موجود ہے۔

؎ پریاں ہوئیں رخت سج کے خُرسند
ہو جیسے ہوا حباب میں بند

کتنی صاف اور نادر تشبیہ ہے!

۵۔ تاج الملوک سرنگ توڑ کر بکاؤلی کے باغ میں داخل ہوتا ہے ؎

صحنِ چمنِ ارم میں اک جا
بوٹا سا تہِ زمیں سے نکلا

۶۔ تاج الملوک پھول لے کر پھر اُسی سرنگ سے واپس ہوتا ہے اُسوقت ہیبت و اندیشے کا ایک عالم طاری ہے اور خاموشی و آہستگی سے

نکل جانے کی فکر دامنگیر۔ اس موقع پر لکھتے ہیں ؎

ہیبت سازیں کے دل میں آیا
اندیشہ کی طرح سے سمایا

اس طرزِ بیان میں شان محاکات بھی موجود ہے۔

۷۔ ایک حسین و نازنین کے بستر کا "فرش گل" ہونا کوئی بہت ہی نادر تمثیل نہیں لیکن اسکا فرش گل سے "نکہت" کی طرح اُٹھنا حد درجہ لطافت و رعنائی سے لبریز ہے ؎

جاگی مرغِ سحر کے غل سے
اُٹھی نکہت سی فرشِ گُل سے

میر عبدالجلیل بلگرامی اپنی "مثنوی" طوی فرخ سیر بادشاہ میں عروس کی خوبصورتی کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ اسی طرح کی مثال دیتے ہیں ؎

زعصمت در حیا پیچیدہ خودرا
چو بو در برگِ گُل دُزدیدہ خودرا

"بو" کا برگ گل میں "دُزدیدہ" ہونا گو نہایت ہی لطیف طرزِ بیان ہو مگر اس میں اتنی اصلیت نہیں جتنی نکہت کے "فرش گل" سے اُٹھنے میں ہے۔

۸۔ ایک جگہ سیاح کی شبنم سے مثال دیکھئے ؎

سیّاح کو کیا قیام سے کار
شبنم نہیں جاگزینِ گلزار

۹۔ تاج الملوک کی ماں رو رہی ہے۔ تاج الملوک بھی جوشِ محبت میں

ماں کے قدموں پر گر پڑتا ہے۔ اس موقع پر لکھتے ہیں ؎

وہ طفل بھی گر پڑا زمیں پر
مانند سرشک چشم مادر

"سرشک چشم" کی مناسبت سے "طفل" کا لفظ اس خوبی سے آیا ہے کہ رعایت لفظی کا شبہہ تک نہیں ہوتا

۱۰۔ وزیر تاج الملوک سے بادشاہ کا پیغام کہکر جواب کا منتظر ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ تاج الملوک کیا جواب دیگا حالتِ امید و بیم میں وزیر کھڑا ہوا ہے۔ اسکے رُکے رہنے کو "مثل دل بدگمان" کہا ہے جس سے اسکے تذبذب کی پوری پوری تصویر سامنے آجاتی ہے ؎

دستور کہ عرض کر چکا تھا
مثل دل بدگماں رُکا تھا

۱۱۔ ؎ بولی وہ کہ بخت تھا زبردست
خورشید کو ذرّے نے کیا پست
انساں سے جھکی پری کی گردن
کانٹے سے رُکا ہَوا کا دامن

انسان کو "ذرّہ" اور "کانٹا" کہا ہے اور پری کو "خورشید" اور "ہَوا" سے تشبیہ دی ہے۔ ان اعلیٰ اور نفیس تشبیہوں کے ساتھ ساتھ "حنائی انگلیوں" کا پنجشاخے سے مقابلہ بھی کیا ہے اور "سرعت رفتار" کو تفنگ سے چلنا بھی کہہ گذرے ہیں۔

لیکن یہ خرابیاں زیادہ تر تناسب لفظی کے باعث پیدا ہوئی ہیں جو اُس زمانہ میں لکھنؤ کا خاص مذاق تھا ؎

واں جلوے حنائی انگلیوں کے یاں روشنی کے تھے پنجشاخے

داغ تو چلے تفنگ سے وہ چھوٹے قیدِ فرنگ سے وہ

صنّائع وبدائع ایک خوبصورت اور حسین آدمی کی نقل وحرکت گفتار ورفتار سے صدہا دلکش ودل آویز ادائیں نکلتی رہتی ہیں ان تمام اداؤں کی باضابطہ فہرست تیار کر لیجئے مگر پھر بھی یہ کہنا ہوگا کہ ع

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

اسی طرح ایک خوش مذاق شاعر کے کلام میں بھی اتنی خوبیاں موجود ہوتی ہیں کہ ضبط تحریر میں لاکر "علم بدیع" کا ایک دفتر بے پایاں مرتب کیا جاسکتا ہے لیکن پھر بھی وہی "بسیار شیوہ ہاست" کہنے کی گنجائش باقی رہجاے گی۔ اسی کے ساتھ جس طرح ایک حسین کی بگڑی ہوئی اداؤں میں بھی ایک دلکشی موجود ہوتی ہے اُسی طرح ایک کریہ المنظر وبدہیئت انسان باوجود ادا وناز کی مشاقیوں کے پھر بھی بدہیئت رہتا ہے بلکہ اکثر تو تکلف ونقالی کے باعث اسکی رہی سہی حیثیت بھی برباد ہوجاتی ہے۔ اور وہ انسان کے ذوق جمالیات کے لئے یکسر سزا و مصیبت بنکر رہ جاتا ہے۔ ٹھیک یہی حالت صنائع وبدائع ونیز دیگر محاسن شعری کی ہے وہ لوگ جنھیں فطرت نے حسنِ شعریت سے محروم رکھا ہے اور وہ زبردستی اس فن کو فن کی حیثیت سے حاصل کرکے اپنی کاوش دماغی کو بہ تکلف صنائع وبدائع

سے مزین کرنا شروع کر دیتے ہیں اور پھر باوجود ان جانکاہیوں کے صحیح الذوق طبقہ اُدھر رخ کرنا بھی پسند نہیں کرتا تو غصہ و عتاب سے اُنکی وہی حالت ہو جاتی ہے جو ایک خشک و متقشف واعظ کی جبکہ اُسکے بے مغز مواعظ پر بے توجہی صرف ہو رہی ہو اور وہ بگڑ بگڑ کر ارباب زمانہ کے فقدان علم و بد ذوقی کا ماتم کر رہا ہو

صنایع بدایع محاسن شعر میں ضرور داخل ہیں لیکن نہ وہ فی نفسہ شعر ہیں اور نہ یہ ضروری ہے کہ اُنکی کثرت سے کلام میں ضرور ہی لطف پیدا ہو جائے بلکہ اُنھیں خوامخواہ اور بہ تکلف استعمال کرنے سے کلام کا رہا سہا حُسن بھی غارت ہو جاتا ہے۔ اس لئے ایک خوش مذاق و نکتہ شناس شاعر ہمیشہ ان چیزوں کو بڑی احتیاط و اعتدال سے استعمال کرتا ہے۔ لیکن وقت کے مذاق اور زمانہ کی رسم کو کیا کیجئے مرثیے ایسے دردناک موضوع کو دیکھئے جسمیں صنعتوں کی خوش ادائی ایسی ہی ہے جیسے رونے میں تال سم کا لحاظ مگر ابھی حال میں ایک ادیب نے جسکے نزدیک محاسن شعر میں صنعتوں کا درجہ خود بہت پست ہے اور جس نے صنعتوں کی تلاش میں کوئی خاص کاوش بھی نہیں کی ڈھائی سَو مصرعے میر انیس کے ایسے درج کئے ہیں جن میں مختلف قسم کی صنعتوں سے کام لیا گیا ہے ان میں صنعت مہملہ یا غیر منقوطہ تک شامل ہے۔ جس زمانے میں مرثئے ایسے دردناک صنف اور میر انیس ایسے باکمال شاعر کا یہ حال ہو اُس زمانہ میں نسیم نے ایک افسانۂ عشق و محبت میں اگر صنعتوں اور لفظی خوش فعلیوں سے کام لیا تو چنداں محل تعجب نہیں۔ بہر حال گلزار نسیم کا بڑا حصہ صنعتوں سے بسر ہے بلکہ اسکے اصلی محاسن تک اسی پردے میں چھپے ہوئے ہیں یہاں نمونتہً چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں:-

۱۔صنعت سوال وجواب: ؎

پوچھا کہ طلب کہا قناعت پوچھا کہ سبب کہا کہ قسمت

۲۔صنعت مشاکلہ۔یعنی دو چیزوں کو ایک ہی جگہ مذکور ہونے کی مناسبت سے ایک ہی لفظ سے تعبیر کریں ؎

میں جا کے جلی تو کچھ نہیں ہائے ڈر ہے کہ نہ تجھ پہ آنچ آجائے

۳۔صنعت تحلیل یا جامع اللسانین ایک ہی طرح کا لفظ یا فقرہ جو دو جگہ استعمال کیا جائے اور دونوں جگہ سیاق کلام میں آجاتا ہو ؎

اک جنگلے میں جا پڑا جہاں گرد صحرائے عدم بھی تھا جہاں گرد

۴۔تجنیس محرف یعنی دو متجانس الفاظ اعداد و ترتیب حروف و الفاظ کے حیثیت سے یکساں ہوں لیکن اُنکے حرکات میں اختلاف ہو ؎

مشکیں زلفوں سے مشکیں کسواؤ کالے ناگوں سے جھکو ڈسواؤ

۵۔تجنیس مضارع۔الفاظ متجانس کے ایک حرف میں اختلاف ہو اور یہ حروف مختلف متحد المخرج یا قریب المخرج بھی ہوں ؎

بہر گہر طلسم اخلاص ہے بحر سخن میں خامہ غواص

حسن تعلیل۔ اس میں کسی ایسی بات یا کسی ایسے وصف کے لئے ایک چیز یا ایک بات کو علت قرار دیتے ہیں جو درحقیقت اُسکی علت نہیں ؎

مثلاً گوشے میں کوئی لگا نہ ہوئے خوشہ کوئی تاکتا نہ ہوئے

ایضاً جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا

صنعت مراعاۃ النظیر یعنی تناسب لفظی کیلئے امانت لکھنوی خصوصیت کے ساتھ شہرت

رکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

دل پھنسانے کو لکھا اُسنے مہاجال پہ خط
جعلسازی کی طرف پھر مرا صیاد آیا

تری جالی کی کرتی کے تصور میں یہ رویا ہوں
مبصر دیکھکر آنکھوں کو کہتے ہیں کہ جالا ہے

میری تربت پر لگایا نیم کا اُسنے درخت
بعد مرنے کے مری توقیر آدھی رہ گئی

قصہ کہنے میں نظر جب آگیا مجھکو وہ گل
گھانس کاٹی عارض رنگیں کا سبزہ دیکھکر

یہ کسکی زلف کی ناگن نے ایدل مار ڈالا ہے
کہ کوسوں تک مری تربت پہ پھیلا کوڑیالا ہے

تو ہے وہ صید فگن دشت میں رکھے جو قدم
آنکھیں آآکے ملیں بھیڑیے گرگابی پر

تیرے گانے سے یہ حالت اے صنم ہو جائیگی
عاشق ناساز کو ہر تال سم ہو جائیگی

لیکن کچھ امانت ہی پر موقوف نہیں رعایت لفظی کی سعی کم و بیش تمام شعرائے لکھنؤ کو مدنظر رہی ہے شیخ ناسخ کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

کہہ رہا ہے اندنوں میری طرح ہر گلعذار
عطر اُسکے کفش کے گل کا اب اے عطار کھینچ

"گل" اُس چمڑے کو بھی کہتے ہیں جسکو کفش میں ایڑی کے مقام پر موچی سی دیتے ہیں۔ اُس گل کی مناسبت سے عطر کھینچنے کا خیال پیدا ہو گیا بہر صورت اگر مذاق صحیح و لطیف اور تخیل میں اعتدال نہوا تو اس صنعت کے باعث اسیطرح کی مضحکہ خیز اور مبتذل باتیں تیار ہو جاتی ہیں۔ گلزار نسیم بھی اس قسم کی خامیوں سے پاک نہیں مثلاً ؎

داغا تو چلے تفنگ سے وہ
چھوٹے قید فرنگ سے وہ

واں دُھن کہ صنم سے کتخدا ہوں
یاں دھیان کہ بت کا پارسا ہوں

ان مخبروں نے جب دیا طول — بولی وہ بکاؤلی کہ معقول

خوش قد وہ چلا گل دمن میں — شمشاد رواں ہوا چمن میں

پانی کے جو بلبلوں میں تھا گل — پہونچا لب حوض سے نہ چنگل

ان اشعار میں بعض بعض مصرعوں اور ٹکڑوں کی بے چستگی سے یہ بھی نمایاں ہے کہ ابتذال سے بچنے کی کوشش ضرور کی گئی ہے لیکن انصاف یہ ہے کہ اس میں پوری پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ گلزار نسیم میں بہ کثرت صنعت مراعات النظیر سے کام لیا گیا ہے اور اُسے جس خوبی و عمدگی سے نبایا گیا ہے اس کے مقابلہ میں اس قسم کی خامیاں بہت کم اور قابل درگذر ہیں۔ چند اشعار جن میں تناسب لفظی کی کامیاب مثالیں موجود ہیں ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ؎

پریوں نے ہوا سے تخت اُتارا

ثابت ہوا ٹوٹتا ستارا

سختی سہی یا کڑی اُٹھائی

افتاد تھی جو پڑی اُٹھائی

داروغہ مجلس تاج الملوک کی سقیم حالت دیکھکر عرض کرتا ہے کہ حضور اس خوبصورت قیدی کی خبر لیجئے۔ کہیں اس چاہ (عشق و محبت) میں اس کی روح نہ پرواز کر جائے ؎

؎ اس چاہ میں کام ہو نہ جائے — یہ ماہ تمام ہو نہ جائے

؎ وہ طفل بھی گر پڑا زمیں پر — مانند سرشک چشم مادر

؎ حاجت کے گماں سے جب ہوئی دیر — جھنجلا کے اُٹھا پلنگ سے شیر

ے سودا ہے مری بماؤلی کو — ہے چاہ بشر کی باؤلی کو

ے مجنوں ہو اگر تو فصد لیجے — سایہ ہو تو دوڑ دھوپ کیجے

اگر خوف طوالت نہ ہوتا تو اس قسم کی اور بہت سی مثالیں پیش کیجا سکتی تھیں جن میں اس صنعت کا استعمال حیرت انگیز کامیابی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

ضرب الامثال کسی شعر یا کسی فقرے کی مقبولیت و ہر دلعزیزی کی اصل علت یہ ہوتی ہے کہ اوّل تو وہ اسقدر حسب حال ہوتا ہے کہ دلوں میں پیوست و جاگزیں ہو جاتا ہے دوسرے یہ کہ اُس کے اسلوب میں ایسی جاسعیت اور اُس کی صفائی و سلاست میں اس درجہ جاذبیت ہوتی ہے کہ وہ فوری دلنشیں ہو کر عام زبانوں پر چڑھ جاتا ہے یہانتک کہ اُس کی حیثیت "ضرب المثل" کی ہو جاتی ہے۔ شعرا نے کبھی کبھی تو ضرب المثل ہی کو نظم کر دیا ہے جسکی مثالیں ذوق کے یہاں بکثرت ملینگی اور کبھی کبھی اشعار اپنی خوبی و سلاست کے اعتبار سے اس حد تک زبان زدِ عام ہو گئے کہ انھوں نے خود ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر لی۔ ان دونوں قسموں کی مثالیں گلزار نسیم میں بکثرت موجود ہیں۔ ان میں سے نمونۃً چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

میٹھا رس اس دیو کو کھلاؤ — گڑ سے جو مرے تو زہر کیوں دو

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے — جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

کانٹوں میں نہ ہو اگر اُلجھنا — تھوڑا لکھا بہت سمجھنا

دونوں کی رہی نہ جان تن میں — کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں

سمجھانے سے تھا ہمیں سروکار / اب مان نہ مان تو ہی مختار

غم، راہ نہیں کہ ساتھ دیجئے / دُکھ، بوجھ نہیں کہ بانٹ لیجئے

ذرّے کا بھی چمکے گا ستارہ / قائم جو زمین و آسماں ہے

کس سوچ میں ہو نسیم بولو / آنکھیں تو ملاؤ دل کہاں ہے

درویش رواں رہے تو بہتر / آب دریا بہے تو بہتر

وہ بولی جو تو کہے زباں سے / تارے تو اُتاروں آسماں سے

نافہمی سے خوار ہو چکے ہو / ابتو سیکھو کہ کھو چکے ہو

رو دِل جو ہوں چاہنے پہ راضی / یہ جان لے کیا کرے گا قاضی

ان اشعار میں کچھ تو وہ ہیں جن میں کسی ضرب المثل اور محاورے کو نظم کیا گیا ہے اور کچھ وہ ہیں جنھوں نے اپنی صفائی و برجستگی اور اپنی سلاست و معنویت کے اعتبار سے بکثرت زبان پر چڑھ کر ضرب المثل کی صورت اختیار کر لی ہے۔

نسیم کی غزلیں | گلزارِ نسیم کے متعلق کچھ بُری بھلی باتیں جو سمجھ میں آئیں عرض کر دی گئیں ع

"شب آخر آمد و افسانہ از افسانہ می خیزد"

مگر اس مثنوی کے ساتھ انکے دیوان کا ایک منتخب مجموعہ بھی شامل ہے اسلئے اُنکی غزل گوئی کے متعلق بھی مختصر طور سے کچھ عرض کر دینا غالباً بے محل نہو۔ پنڈت برج نرائن چکبست نے لکھا ہے کہ اُن (نسیم) کی

غزلوں میں بعد کو لوگوں نے "مفت کرم داشتن" کے طور پر کچھ اشعار اپنی طرف سے بڑھا دیے، ممکن ہے یہ صحیح ہو لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اُن کے اکثر اشعار میں اُنکا خاص رنگ طبیعت، صاف صاف نمایاں ہے۔ مثلاً

جب نہ جیتے جی مرے کام آئیگی
کیا یہ دُنیا عاقبت بخشائیگی

جب ہو چکی شراب تو میں مست مر گیا
شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا

لیکن باوجود اسکے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُنکی (نسیم) زیادہ توجہ مثنوی ہی کی جانب مائل رہی۔ یہی وجہ ہے کہ مثنوی اُنھوں نے اپنی حیات ہی میں طبع کرائی مگر غزلوں کی طرف چنداں اعتنا نہ کی۔ اس لحاظ سے اگر اُنکی غزلوں کا مرتبہ اُن کی مثنوی سے فروتر ہو تو تعجب نہیں۔ بایں ہمہ وہ اپنی غزلوں میں اسطرح کے اشعار بھی نکالنے میں کامیاب ہوئے ہیں ؎

خاکساری وہ ہے کہ ذرّوں پر — روز باران نور ہوتا ہے

خاک دیکھا کچھ شبستانِ جہاں میں او نسیم — ڈھیر پروانوں کا تھا شمعِ سحر کے سامنے

سمجھا ہے حق کو اپنے ہی جانب ہر ایک شخص — یہ چاند اُسکے ساتھ چلا جو جدھر گیا

کوچۂ جاناں کی ملتی تھی نہ راہ — بند کیں آنکھیں تو رستہ کھل گیا

خواہ کعبہ خواہ بتخانے کو جا — دشت دل کا رہگذر ہی دو طرف

ذلت ہے جو پھیلائے بشر پیش بشر ہاتھ — یارب نہ کہیں ہاتھ کا ہو دست نگر ہاتھ

آن میں فرق نہ آنے دیجے جان اگر جائے تو جانے دیجے

نسیم کا عام مرتبۂ شاعری

استادانہ شہرت ونا موری کے لئے تنہا خوش گوئی عام طور پر کافی نہیں ہوتی بلکہ اسکے لئے اور بھی کچھ سامان کا فراہم ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے مثلاً شاگردوں کی ایک مسلح فوج ٹکسالی زبان کا ادعا۔ متروکات کی ایک طولانی فہرست۔ بحور و زحافات پر کافی عبور۔ پندار و تبختر کے تیور وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام باتیں ایک نوعمر ہندو شاعر کو جس نے پیشے کے طور پر نہیں بلکہ شوقیہ اس کام کو شروع کیا ہو کہاں میسّر آسکتی تھیں۔ اسلئے نسیم کا نام اُستادان فن کے ساتھ لینا ناقابل عفو جُرم ہوگا۔ نسیم نے سوء اتفاق سے وہ سن بھی نہیں پایا کہ اُنکے متعلق اُستادی کا کسی کو گمان ہو سکے۔ اس لئے نہیں کہ انھیں "زبان و محاورے" پر عبور حاصل کرنا باقی تھا۔ یا ہنوز انھیں مشق سخن کی ضرورت تھی بلکہ اس لئے کہ اگر شاعری نام ہے مطالعہ فطرت و تجربات نفس کا تو اُسکے لئے اُنھیں کافی وقت نہیں مل سکا۔

انگریزی زبان کے نقادوں نے اندرونی شہادتوں کی بنا پر یہ رائے قائم کی ہے کہ شیکسپیر کا ابتدائی کارنامہ لوز لیبر لاسٹ (Labour Last) سے شروع ہوتا ہے اور ٹمپسٹ (Tempest) پر ختم ہو جاتا ہے۔ اسمیں اس عظیم المرتبت شاعر کے خیالات و جذبات کے ارتقائی مدارج صاف صاف نمایاں ہیں۔ اُسکی شاعری کا سفر شباب کے وارفتگی و سرشاری سے شروع ہوتا ہے۔ پھر قویٰ کا اضمحلال۔ موجودات کی نمود بے بود اُسے ٹریجڈی کی

جانب مائل کرتی ہے۔ بالآخر پرجوش خیال اُسے اُس عالم خواب وگم شدگی میں پہونچا دیتا ہے جہاں غم ومسرّت۔ لذّت والم۔ بلکہ حیات و ممات تک باہم مل جل کر محو وگم ہو جاتے ہیں۔

نسیم کا جو کلام ہمارے سامنے موجود ہے اُس سے لکھنؤ اسکول کی اجتماعی ذہنیت اور دو تصنّع بےکیفی و بے تاثیری کے باوجود ایک نوجوان زندگی کے امکانات و توقّعات کا بھی اندازہ ہوتا ہے مرنے سے کچھ دیر پہلے اُنھوں نے یہ شعر کہا تھا ؎

پہونچی نہ راحت ہم سے کسی کو بلکہ اذیت کوش ہوئے
جان پڑی تب بار شکم تھے۔ مر کے وبال دوش ہوئے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی اصل فطرت مذکورہ منازل کی راہوں سے پوری طرح باخبر تھی اور اگر قضائے الٰہی چندے اور توقف کرتی تو بعید نہیں کہ ہم اُس سے وہ نغمے بھی سُنتے جو بالاخانوں پر نہیں بلکہ روح کی پاکیزہ گہرائیوں میں تیار ہوتے ہیں اور جنکے لئے آسمان کے ستارے اور زمین کے چمکتے ہوئے ذرّے یکساں طور پر گوش برآواز ہیں۔ فقط۔

احقر اصغر (مصنّف "نشاط روح")

مثنوی گلزارِ نسیم

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری	ثمرہ ہے قلم کا حمدِ باری
کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر	حمدِ حق و مدحتِ پیمبر
پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے	یعنی کہ مطیعِ پنجتن[1] ہے
ختم اُسپہ ہوئی سخن پرستی	کرتا ہے زبان کی بہ بندستی

خواستگاری جناب باری سے مثنوی گلزارِ نسیم کی ترتیب کے واسطے

یارب مرے خامے کو زباں دے	منقارِ ہزار داستاں دے
افسانہ گُلِ بکاؤلی کا	افسوں ہو بہارِ عاشقی کا
ہر چند سُنا گیا ہے اسکو	اُردو کی زبان میں سخن گو

ع[1] پنجتن:۔ حضرت[1] محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ حضرت[2] علی کرم اللہ وجہہ۔ حضرت[3] امام حسن علیہ السلام حضرت[4] امام حسین علیہ السلام۔ اور حضرت[5] فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا۔

وہ نثر ہے داد نظم دوں میں — اس[1] مے کو دو آتشہ کروں میں
ہر چند اگلے جو اہلِ فن تھے — سلطانِ قلمروِ سخن تھے
آگے اُنکے فروغ پانا — سورج[2] کو چراغ ہی دکھانا
پر بحرِ سخن سدا ہے باقی — دریا[3] نہیں کار بند ساقی
طعنے سے زبانِ نکتہ چیں روک — رکھ دے مری اہل خامہ[4] میں نوک
خوبی سے کرے دلوں کو تسخیر — نیرنگِ نسیمِ باغِ کشمیر
نقطے ہوں سپند خوش بیانی — جدول ہو حصارِ سحر[5] خوانی
جو نکتہ لکھوں کہیں نہ حرف آئے — مرکز پہ[6] کشش مری پہنچ جائے

۱؎ نظم سے چونکہ داستان کے لطف و کیفیت میں اضافہ ہوگا اسلئے اسے "دو آتشہ کرنا" کہا ہے۔ شراب کی جب دوبارہ کشید ہو تو وہ اور زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔

۲؎ سورج کو چراغ دکھانا اب ایک مستقبل محاورہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح سورج کے آگے چراغ کی روشنی ماند ہو جاتی ہے اسیطرح اگلے صاحبان کمال کے سامنے اپنا کمال بے حقیقت ہے۔

۳؎ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ساقی کے کمالِ ساقی گری کے باوجود "دریا" میں کمی نہیں ہو جاتی اُسی طرح اگلے صاحبان فن نے اگرچہ اپنا کمال نہایت خوبی سے انجام دیا ہی لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ نفسِ کمال کا خاتمہ ہو گیا۔

۴؎ مطبع نظامی کانپور کی چھپی ہوئی مثنوی گلزار نسیم میں "اہلِ خامے" ہے لیکن پنڈت برج نراین چکبست اور مطبع نولکشور کے جمع کئے ہوئے نسخوں میں اہل خامہ ہے یہ کاتبوں کے طرز تحریر کا اختلاف ہے۔

۵؎ چونکہ "سحر خوانی" کا ذکر کیا ہے اسلئے اسکی لفظی رعایت سے تسخیر، نیرنگ، سپند اور حصار وغیرہ کے الفاظ لائے ہیں اسلئے کہ سحر خوانی کے لوازم میں سے یہ چیزیں ہیں۔ سپند کالے دانے کو کہتے ہیں۔ سحر اور جادو کرنے والے لوگ سحر خوانی کے وقت اسے آگ میں ڈالتے ہیں۔ ان اشعار میں صنعت مراعات النظیر سے کام لیا گیا ہی۔

۶؎ یعنی ٹھیک ٹھیک مفہوم کو ادا کر دوں، نکتہ، حرف، مرکز، کشش میں بھی رعایت لفظی ہی اور یہ صنعت بھی صنعت مراعات النظیر ہے۔

داستان تاج الملوک شاہزادہ اور زین الملوک بادشاہِ مشرق کی

روداد زمانِ پاستانی ؎ | یوں نقل ہے خامے کی زبانی
پورب میں ایک تھا شہنشاہ | سلطان زین الملوک ذی جاہ
لشکر کش و تاجدار تھا وہ | دشمن کُش و شہر یار تھا وہ
خالق نے دیئے تھے چار فرزند | دانا عاقل ذکی خردمند
نقشا ایک اور نے جمایا | پس ماندہ کا پیش خیمہ آیا
امید کے نخل نے دیا بار | خورشید حمل[۱] ہوا نمودار
وہ نور کہ صدقے مہر انور | وہ رُخ کہ نہ ٹھہرے آنکھ جس پر
نور آنکھ کا کہتے ہیں پسر کو | چشمک تھی نصیب اس پدر کو
خوش ہوتے ہی طفلِ مہ جبیں سے | ثابت یہ ہوا ستارہ بیں سے

۱؎ حمل کا صحیح تلفظ بسکون میم ہے مگر شاید لفظ خورشید کی رعایت سے اُسے بحرکت میم لکھا ہے کیونکہ منجملہ دوازدہ بروج کے حمل بھی ایک بُرج ہے اور وہ بحرکت میم ہے لیکن دیگر شعرا نے بھی حمل بہ حرکت میم نظم کیا ہے۔ چند مثالیں یہ ہیں۔

(۱) واجد علی شاہ آخری فرمانروائے اودھ کا شعر مثنوی دریائے تعشق میں ہے ؎

گھر میں میرے بھی اے خوش اطوار | آثار حمل کے ہیں نمودار ؎

(۲) جانصاحب۔ دائی یقین دلکو ہے گر جائیگا حمل | ننھا سا لڑکا خواب میں کلمہ پیٹ مل گیا

(۳) سودا ۔ اسقاطِ حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا | پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اسی کو | پھر دیکھ نہ سکے گا کسی کو

نظروں سے گرا وہ طفلِ ابتر | مانندِ سرشکِ دیدۂ تر

پردے سے نہ دایہ نے نکالا | پتلی سا نگاہ رکھ کے پالا

تھا افسرِ خسرواں وہ گلفام | پالا تاج الملوک رکھ نام

جب نامِ خدا[1] جواں ہوا وہ | مانندِ نظر رواں ہوا وہ

آتا تھا شکارگاہ سے شاہ | نظارہ[2] کیا پسر کا ناگاہ

صاد[3] آنکھوں کی دیکھ کر پسر کی | بینائی کے چہرے پر نظر کی

مُہرِ لبِ شہ ہوئی خموشی | کی نور بصر سے چشم[4] پوشی

دی آنکھ جو شہ نے رونمائی | چشمک سے نہ بھائیوں کو بھائی

ہرچند کہ بادشہ نے ٹالا | اُس ماہ کو شہر سے نکالا

ھ۱ نامِ خدا۔ محاورہ ہے۔ یعنی خدا کی مہربانی سے۔

ھ۲ گلزارِ نسیم مطبوعہ نظامی پریس کانپور میں یہ مصرعہ ہے ع نظارہ کیا پدر نے ناگاہ۔

ھ۳ "صاد" منظور کرنے کی علامت۔ علامت تصدیق و اقرار۔ اصطلاحِ شعر میں تشبیہہ چشم ہے۔ "چہرہ نظری کرنا" شاہی دفتر کی اصطلاح تھی۔ جب کسی کا نام کاٹ دیتے تھے تو اُس موقع پر بولتے تھے۔

اس شعر میں صاد۔ چہرہ نظر وغیرہ کے الفاظ دفتری اصطلاح کی رعایت سے ہیں۔

ھ۴ "چشم پوشی کرنا"۔ ٹالنا۔ "نور بصر" یعنی لڑکا۔ شعر کا ایک مطلب یہ ہے کہ بادشاہ خاموش ہو گیا اور بینائی چشم سے آنکھیں بند کر لیں۔ یعنی بینائی جاتی رہی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ خاموش ہو گیا اور شاہزادے کے دیکھنے سے جو بینائی زائل ہو گئی تھی اس امر کو ٹال گیا۔ گلزار نسیم کے ایک اور اڈیشن میں یہ مصرعہ اس طرح ہے ع کی نور بصر نے چشم پوشی۔

گھر گھر یہی ذکر تھا یہی شور | خارج ہوا نورِ دیدۂ کور
آیا کوئی لے کے نسخۂ نور | لایا کوئی جا کے سرمۂ طور
تقدیر سے چل سکا نہ کچھ زور | بینا نہ ہوا وہ دیدۂ کور
ہوتا ہے وہی خدا جو چاہے | مختار ہے جس طرح نباہے

جانا چاروں شاہزادوں کا بہ تجویزِ کحال تلاش گُلِ بکاؤلی کو

پایا جو سفید چشم صفحا[۵۱] | یوں میلِ قلم نے سُرمہ کھینچا
تھا ایک کحال پیر دیریں | عیسیٰ کی تھیں اُسنے آنکھیں دیکھیں[۵۲]
وہ مردِ خدا بہت کراہا[۵۳] | سلطان سے ملا کہا کہ شاہا
ہے باغ بکاؤلی میں اک گُل | پلکوں سے اُسی پہ مار چٹکل
خورشید میں یہ ضیا کرن کی | ہے مہر گیا اُسی چمن کی
اُس نے تو گلِ ارم بتایا | لوگوں کو شگوفہ[۵۴] ہاتھ آیا

---

۵۱ "چشم صفحا" کی جگہ پر "چشم صفحہ" چاہئے تھا۔ کھینچا کے ساتھ صفحا کا قافیہ صحیح ہے مگر "چشم صفحا" (یعنی فارسی ترکیب کے ساتھ) کا قافیہ "کھینچا" صحیح نہیں سمجھا جاتا۔

۵۲ "آنکھیں دیکھیں تھیں"۔ محاورہ ہے جسکے معنی ہیں "شاگردی کی تھی"۔

۵۳ کراہا بمعنی افسوس کیا۔ اب یہ محاورہ ان معنوں میں مستعمل نہیں ہے۔

۵۴ "شگوفہ ہاتھ آنا"۔ سامان تفریح مل جانا۔

شہزادے ہوئے وہ چاروں تیار — رخصت کئے شہ نے چار ناچار

شاہانہ چلے وہ لیکے ہمراہ — لشکر، اسباب، خیمے، خرگاہ

وہ بادیہ گرد خانہ برباد — یعنی تاج الملوک ناشاد

میدان میں خاک اڑا رہا تھا — دیکھا تو وہ لشکر آ رہا تھا

پوچھا تم لوگ خیل کے خیل — جاتے ہو کدھر کو صورتِ سیل

بولا لشکر کا اک سپاہی — جاتی ہے اِرم کو فوج شاہی

سلطان زین الملوک شہزور — دیدار پسر سے ہو گیا کور

منظور علاج روشنی ہے — مطلوب گُلِ بکاولی ہے

گُل کی جو خبر سنائی اُسکو — گُلشن کی ہوا[1] سمائی اُسکو

ہمرہ کسی لشکری کے ہو کر — قسمت پہ چلا یہ نیک اختر

غلام ہونا چاروں شہزادوں کا چوسر کھیل کر دلبر بیسوا سے

نقطوں سے قلم کے مہرہ بازی — یوں لاتی ہے رنگ بدطرازی

یکچند پھرا کیا وہ انبوہ — صحرا صحرا و کوہ در کوہ

بلبل ہوئے سب ہزار جی سے — گُل کا نہ پتا لگا کسی سے

وارد ہوئے اک جگہ سرِ شام — فردوس تھا اُس مقام کا نام

اک نہر تھی شہر کے برابر — ٹھٹکے سیّارے[2] کہکشاں پر

ف۱ "ہوا سمائی" محاورہ ہے۔ یعنی خواہش پیدا ہوئی۔

ف۲ جو لوگ پھول کی تلاش میں نکلے تھے (یعنی چاروں شاہزادے) انھیں سیّارہ کہا ہے اور نہر کو کہکشاں سے استعارہ کیا ہے

اک باغ تھا نہر کے کنارے　　جو پائے گُل اُسطرف سدھارے
دلبر نام اک بیسوا تھی ٹھہ　　اُس ماہ کی واں محل سرا تھی
دروازے سے فاصلہ پہ گھر تھا　　نقّارہ چوبدار در تھا
بیجا و بجا نہ سمجھے انجان　　نقارہ بجا کے ٹھہرے نادان
آواز پہ وہ لگی ہوئی تھی　　آپ آن کے ٹھاٹ دیکھتی تھی
جس شخص کو مالدار پاتی　　باہر سے اُسے لگا کے لاتی
بٹھلا کے جوئے کا ذکر اُٹھا کر　　چوسر میں وہ لوٹتی سراسر
جیت اُسکی تھی ہاتھ جو کچھ آتا　　اُسکا کوئی ہتکنڈا نہ پاتا
بلّی کا سر چراغ داں تھا　　چوہا پاسے کا پاسباں تھا
اُلٹاتی[1] اڑی پہ قسمت آسا　　بلّی جو دیا تو موس پاسا
جیتے ہوئے بندی[2] تھے ہزاروں　　قسمت نے پھنسلائے یہی چاروں
صیادنی[3] لائی پھانس کر صید　　کرسی پر بٹھلائے نقش اُمید
گھاتیں ہوئیں دلربائیوں کی　　باتیں ہوئیں آشنائیوں کی
رنگ اُسکا جما تو لا کے چوسر　　کھیلی وہ کھلاڑ[4] بازی بدکر

---

[1] یعنی جب وہ ہارنے لگتی تو بلّی دئے کو اور موس پاسے کو اُلٹ دیتا اور اس طرح وہ ہاری ہوئی بازی جیت جاتی۔ پنڈت برج نراین چکبست کے نسخے میں بجائے اُلٹاتی کے اُلٹاتے ہے۔

[2] پنڈت برج نراین چکبست کے نسخے میں 'بندے' یائے مجہول ہے لیکن 'بندی' یائے معروف صحیح معلوم ہوتا ہے بمعنی قیدی

[3] گلزار نسیم مطبوعہ نظامی پریس کانپور میں "صیادنی" ہے۔ لیکن پنڈت برج نراین چکبست اپنے ایڈیشن میں اس مصرعہ کو اسطرح لکھتے ہیں ع صیاد تھی لائی پھانس کر صید۔

[4] کھلاڑ کے لغوی معنی کھیلنے والی کے ہوئے لیکن محاورہ میں زن قحبہ کو بھی کہتے ہیں۔

وہ چھوٹ پہ تھی یہ پیل سمجھے | بازی چوسر کی کھیل سمجھے
مغرور تھے مال و زر پہ کھیلے | سامان ہارے تو سر پہ کھیلے
بدبختی سے آخری جُوا تھا | بندہ ہونا بدا ہوا تھا
دو ہاتھ میں چاروں اُسنے لُوٹے | پنجے میں پھنسے تو چھکّے چھوٹے
ایک ایک سے رات بھر نہ چھوٹا | پَو پھٹتے ہی جگ اُنھوں کا ٹوٹا
زنداں کو چلے مچل مچل کر | نردوں کی طرح پھرے نہ چلکر
لشکر میں سے جو گیا سوئے شہر | پانی سا پھرا نہ جانب نہر

جیتنا تاج المُلوک کا دلبر بیسوا کو اور چھوڑ کر روانہ ہونا تلاش گُل بکاؤلی میں

لانا زرِ گُل جو ہے ارم سے | یوں صفحے پہ نقش ہے قلم سے
وہ ریگ رواں کا گردِ لشکر | یعنی تاج الملوک ابتر
حیران ہوا کہ یا الٰہی | لشکر پہ یہ کیا پڑی تباہی
اُٹھا کہ خبر تو لیجے چلکر | گذرا درِ باغ بیسوا پر
حیران تھا یہ بلند پایہ | نکلی اندر سے ایک دایہ

سلہ چاروں۔ پنجے۔ چھکّے اور پَو چوسر کی اصطلاحیں ہیں۔

سلہ پَو پھٹنا۔ محاورہ ہے۔ یعنی صبح ہونا۔ پَو چوسر کی اصطلاح ہے۔ اور جُگ بھی۔

سلہ "اُنھوں کا" اب متروک ہے اسکی جگہ "اب اُنکا" یا "اُن سب کا" بولتے ہیں۔

لڑکا کوئی کھو گیا تھا اُس کا ہمشکل یہ مہ لقا تھا اُس کا

بولی وہ کہ نام کیا ہے تیرا فرزند اسی شکل کا تھا ہیرا

بولا وہ کہ نام تو نہیں یاد طفلی میں ہوا ہوں خانہ برباد

لیکن یہ میں جانتا ہوں دلگیر مادر تھی میری بھی ایسی ہی پیر

بیٹا وہ سمجھ کے جی سے اُسکو گھبرائی ہنسی خوشی سے اُسکو

چلتے[۵۱] تھے اُدھر سے دو جُواری ایک ایک کی کر رہا تھا خواری

کہتے تھے فریب دو گے کیا تم شہزادے نہ ہم نہ بیسوا تم

ذکر اپنے برادروں کا سُن کر بولا وہ عزیز سُن تو مادر

کون ایسی کھلاڑ بیسوا ہے شہزادوں کو جسنے زچ[۵۲] کیا ہے

بولی وہ کہ ہاں جُوا ہے بدکام دلبر اک بیسوا ہے خود کام

بلّی پہ چراغ رکھ کے شب کو چوسر میں وہ لُوٹتی ہے سب کو

پاسے کی ہے کل چراغ کے ساتھ وہ بلّی کے سر پہ چوہے کے ہاتھ

شہزادے کہیں کے تھے بد اقبال بندی[۵۳] ہوئے ہار کر زر و مال

بھائی تھے جوشِ خوں کہاں جائے صدمہ ہوا درد سے کہا ہائے

پاسے کا چراغ کا اُلٹ پھیر سوجھا نہ اُنھیں یہ دیکھو اندھیر

سوچا وہ کہ ابتو ہم ہیں آگاہ جیتے ہیں تو جیت لینگے ناگاہ

---

۵۱ ایک نسخے میں بجائے چلتے تھے کے "جاتے تھے" لکھا ہوا ہے۔

۵۲ زچ کرنا۔ عاجز کر دینا اور "زچ" شطرنج کی اصطلاح بھی ہے۔

۵۳ پنڈت برج نرائن چکبست کے نسخے میں بندے یائے مجہول سے لکھا ہے۔

اک بلّی جو چھپٹی چوہے کو بھانپ — نیوے نے بھگا دیا دکھا سانپ

سمجھا وہ کہ ہے شگوں نرالا — نیولا پکڑ آستیں میں پالا

چوسر ہی کے سیکھنے کو یکسر — گھوما وہ برنگِ نرد گھر گھر

اک روز اُسے مل گیا امیر ایک — وہ صاحبِ جاہ دل سے تھا نیک

اشراف سمجھ کے لے گیا گھر — بخشا اُسے اسپ و جامہ و زر

اُس گُل کے جو ہاتھ میں زر آیا — جانبازی کو سوئے دلبر آیا

ملتی تھی کھلاڑ ڈنکے کی چوٹ — نقارہ و چوب میں چلی چوٹ

آواز وہ سُن کے در پہ آئی — ہمراہ اُسے لے کے اندر آئی

کام اُسکا تھا بسکہ کھیل کھانا — چوسر کا جما وہ کارخانہ

وہ چشم و چراغ بیسوا کے — کرنے لگے تاک جھانک آ کے

نیولا جو کہ مارِ آستیں تھا — چٹکی کے بجاتے ہی وہیں تھا

بلّی تو چراغ پا تھی خاموش — بل ہوگیا موش کو فراموش

ہنس ہنس کے حریف نے رُلایا — مانندِ چراغ اُسے جلایا

بارے بہ ہزار بد دماغی — لی خضر نے غول سے چراغی

پاسے سے چلی نہ جعل سازی — اُجڑی وہ بسا بسا کے بازی

---

۵۱ چوسر کی رعایت سے نرد اور گھر گھر کے الفاظ ہیں۔ یہ صنعت مراعات النظیر ہے۔
۵۲ "ڈنکے کی چوٹ" محاورہ ہے بمعنی کھلم کھلا۔
۵۳ "چوٹ چلنا" محاورہ ہے بمعنی ایک دوسرے پر وار کرنا۔
۵۴ "کھیل کھانا" یعنی ناجائز طریقے سے آمدنی حاصل کرنا۔
۵۵ "مارِ آستیں" یعنی چھپا ہوا دوست نما دشمن۔
۵۶ "چراغ پا ہونا" خفا ہونا۔ نہ جمنا۔ خفا ہونا۔ کھسک جانا
۵۷ چراغی لینا۔ نذر بھینٹ لینا۔ خضر کا کام راستہ بتانا ہے اور غول کا کام گمراہ کرنا ہے۔

سب ہار کے نقد و جنس بارے ۔۔۔ جیتے ہوئے بندے بد کے ہارے

بنیاد جو کچھ تھی جب گنوائی ۔۔۔ تب خود وہ کھلاڑ مہرے[۱] آئی

پھر پاسے نے کی نہ پاسداری ۔۔۔ ہمت کی طرح وہ دل سے ہاری

پاسے کی بدی ہے آشکارا ۔۔۔ راجہ نل[۲] سلطنت ہے ہارا

دانا تو کرے کب اسطرح میل ۔۔۔ ہارا ہے جوئے کے نام سے بیل

بارے دیکھا جو بیوا نے ۔۔۔ بندہ کیا غیر کا خدا نے

سوچی کہ نہ اب بھی چال رہیے ۔۔۔ شادی کا مزا نکال رہیے

بولی بہ ہزار عجز و زاری ۔۔۔ تم جیتے میاں میں تم سے ہاری

لونڈی ہوں نہیں عدول مجھکو ۔۔۔ خدمت میں کرو قبول مجھکو

بولا وہ کہ سُن یہ ہتکنڈے چھوڑ ۔۔۔ نقارۂ در کو چوب سے توڑ

یہ مال یہ زر یہ جیتے بندے ۔۔۔ یونہیں انھیں رکھ بجنس چندے

بالفعل ارم کو جاتے ہیں ہم ۔۔۔ انشاء اللہ آتے ہیں ہم

بولی وہ سُنو تو بندہ پرور ۔۔۔ گلزار ارم ہے پریوں کا گھر

انسان و پری کا سامنا کیا ۔۔۔ مُٹھی میں ہوا کا تھامنا کیا

شہزادہ ہنسا کہا کہ دلبر ۔۔۔ کچھ بات نہیں جو رکھئے[۳] دل پر

انسان کی عقل اگر نہ ہو گُم ۔۔۔ ہے چشم پری میں جائے مردم

یہ کہکے اُٹھا کہا کہ لو جان ۔۔۔ جاتے ہیں کہا خدا نگہبان

---

[۱] مہرے آنا۔ مقابلہ پر آنا۔ [۲] اگلے زمانے میں دریائے سندھ کے قریب نشدھ نامی ایک سلطنت تھی ویرسین وہاں کا راجہ تھا جسکے دو لڑکے تھے بڑے کا نام نل اور چھوٹے کا پشکر تھا راجہ نل نے بدربھ دیس (موجودہ برار) کی راجکماری سے شادی کی تھی۔ راجہ نل جوئے میں اپنی سلطنت ہار گیا تھا پھر اور بہت سے واقعات کے بعد اُس نے دوبارہ اپنی سلطنت حاصل کر لی۔ [۳] دل پر رکھنا۔ مصمم ارادہ کر لینا۔

دولت تھی اگر چہ اختیاری　　پا مردی سے اُسپہ لات[1] ماری
جز جیب نہ مال پر پڑا ہاتھ　　جز سایہ نہ کوئی بھی لیا ساتھ
درویش تھا بندۂ خدا وہ　　اللہ کے نام پر چلا وہ

پہنچنا تاج الملوک کا سرنگ کھدوا کر باغ بکاؤلی میں اور گل لے کر پھرنا

کرتا ہے جو طے سواد نامہ　　یوں حرف ہیں نقش پائے خامہ
وہ دامنِ دشت شوق کا خار　　یعنی تاج الملوک دل زار
اک جنگلے میں جا پڑا جہان گرد　　صحرائے عدم بھی تھا جہان گرد
سائے کو پتا نہ تھا شجر کا　　عنقا[2] تھا نام جانور کا
مرغان ہوا تھے ہوش راہی　　نقشِ کفِ پا تھی ریگ[3] ماہی
وہ دشت کہ جسمیں پر تنگ ودو　　یا ریگ رواں تھی یا وہ رہرو
ڈانڈا تھا ارم کے بادشا کا　　ایک دیو تھا پاسباں بلا کا
دانت اُسکے[4] تھے گورکن قضا کے　　دو تھنے رہِ عدم کے ناگے

سلہ کسی چیز پر لات مارنا محاورہ ہے۔ یعنی اُسکو چھوڑ دینا کنارہ کشی کرنا۔
سلہ عنقا ایک چڑیا کا نام ہے جسکو کسی نے دیکھا نہیں صرف شہرت ہی شہرت ہے اس مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ جانور وہاں ناپید تھے۔
سلہ ایک جانور ہے جو مچھلی سے مشابہ ہوتا ہے اور ریگستانوں میں رہتا ہے۔
سلہ مطبع نظامی کے نسخے میں یہ مصرعہ اسطرح ہے۔ ع دانت اُسکے گورکن قضا کے۔

سر پر پایا بلا کو اُس نے — تسلیم کیا قضا کو اُس نے
بھوکا کئی دن کا تھا وہ ناپاک — فاقوں سے رہا تھا پھانک کر خاک
بے ریشہ یہ طفل نوجواں تھا — حلوا بے دود بے گماں تھا
بولا کہ چکھونگا میں یہ انساں — اللہ اللہ شکرِ احساں
شہزادہ کہ منہ میں تھا اجل کے — اندیشہ سے رہ گیا دہل کے
پل مارنے کی ہوئی جو دیری[1] — سبحان اللہ شان تیری
اشتر کئی جاتے تھے اُدھر سے — پُر آرد و روغن و شکر سے
وہ دیو لپک کے مار لایا — غراتے ہوئے شکار لایا
اونٹوں کی جو لوتھیں[2] دیو لایا — دم اُسکا نہ اُس گھڑی سمایا
تیورا کے وہیں وہ بار بر دوش — بیٹھا تو گرا گرا تو بیہوش
چاہا اس نے کہ مار ڈالو — یا بھاگ سکو تو راستا لو
وہ اونٹ تھے کاروانیوں کے — سب ٹھاٹھ تھے میہمانیوں کے
میدا بھی شکر بھی گھی بھی پایا — خاطر میں یہ اُس بشر کے آیا
میٹھا اس دیو کو کھلاؤ — گرگے[3] سے جو مرے تو زہر کیوں دو
حلوے کی پکا کے ایک کڑھائی — شیرینی دیو کو چڑھائی
ہر چند کہ تھا وہ دیو کڑوا[4] — حلوے سے کیا منہ اُسکا میٹھا

سلہ یہ لفظ اب متروک ہے اب بجائے اسکے "دیر" بولتے ہیں۔ سلہ لاشیں۔

سلہ یہ محاورہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مہربانی کرنے سے جو قابو میں آسکے اُسپر سختی کیوں کیجائے۔

سلہ کڑوا کے معنی تند مزاج کے بھی ہیں۔ "کڑوا اور میٹھا" میں صنعت تضاد یا صنعت طباق ہے۔

کہنے لگا کیا مزا ہے دلخواہ　　اے آدمی زاد واہ وا واہ

چیز اچھی کھلائی تونے مجھکو　　کیا اُسکی عوض میں دوں مَیں تجھکو

بولا وہ کہ پہلے قول دیجئے　　پھر جو میں کہوں قبول کیجئے

وہ ہاتھ پر اُس کے مار کر ہاتھ　　بولا کہ ہے قول جان کے ساتھ

بولا وہ کہ قول اگر یہی ہے　　بد عہدی[1] کی پر نہیں سہی ہے

گلزارِ ارم کی ہے مجھے دُھن　　بولا کہ ارے بشر وہ گلبن

خورشید کے ہم نظر نہیں ہے　　اندیشے کا واں گزر نہیں ہے

واں موج ہوا ہوا پہ اژدر　　واں ریگ زمیں زمیں پہ اخگر

ہوتا نہ جو قول کا سہارا　　بچتا نہ کہیں تو خیر ہارا

رہ جا مرا بھائی ایک ہے اور　　شاید کچھ اُس سے بن پڑے طور

اک ٹیکرے پر گیا بلایا　　وہ مثلِ صدائے[2] کوہ آیا

حال اُس سے کہا کہ قول ہارا　　ہے پیر[3] یہ نوجواں ہمارا

مشتاق ارم کی سیر کا ہے　　کوشش کرو کام خیر کا ہے

حمالہ نام دیونی ایک　　چھوٹی بہن اُسکی تھی بڑی نیک

خط اُس کو لکھا بایں عبارت　　اے خواہرِ مہرباں سلامت

پیارا یہ مرا ہے آدمی زاد　　رکھیو اسے جس طرح مری یاد

انسان ہے چاہے کچھ جو سازش　　مہمان ہے کیجیو نوازش

---

[1] یعنی اب قول سے پھرنے کی سند نہیں ہے۔ [2] یعنی صدائے بازگشت۔

[3] یہ جوان ہمارا پیر ہے یعنی یہ کہ یہ جوان ہمارا بہت ہی مکرم و محترم ہے۔ "پیر" اور "جوان" میں صنعت تضاد ہے۔

خط دے کے بشر کو دے اُڑا دیو　　پہنچا حمّالہ پاس بے ریو
بھائی کا جو خط بہن نے پایا　　بھیجے ہوئے کو گلے لگا یا
اُس دیونی پاس اک حسیں تھی　　زنبور کے گھر میں انگبیں تھی
محمودا نامِ دختِ آدم　　لے آئی تھی دیکھے دیونی دم
جوڑا ہم جنس ہاتھ آیا　　محمودا کے گلے لگا یا
دن بھر تو الگ تھلگ ہی تھے وہ　　دو وقت[1] سے شام کو ملے وہ
تھے ضبط و حیا کے امتحاں میں　　پردہ رہا ماہ میں کتاں میں
آپس میں کُھلے نہ شرم سے وہ　　خاطر کی طرح گرہ رہے وہ
بولا وہ فسردہ دل سحر گاہ　　کیا سرد ہوا ہے واہ وا واہ
بولی[3] وہ کہ ہونے کو ہوا ہے　　جو غنچے کو گُل کرے صبا ہے
بولا وہ یہی تو چاہتا ہوں　　گُل[4] پاؤں تو میں ابھی ہوا ہوں

---

۱ یعنی شام کو جس طرح دونوں وقت آپس میں ملتے ہیں۔ اسطرح محمودا اور تاج الملوک باہم ملے۔

۲ کھلنا۔ بمعنی بے تکلف ہونا کُھلنے کی رعایت سے دوسرے مصرعہ میں گرہ کا لفظ لائے ہیں۔

۳ محمودا نے ہوا کے ذکر پر کنایۃً لگاوٹ کا اظہار کیا ہے کہ ع جو غنچے کو گل کرے صبا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے دل کی کلی کھلے تو میں سمجھوں کہ ہوا ہے تاج الملوک تجاہل عارفانہ کے طور پر "غنچہ" اور "گل" کا پہلو پا کر گل بکاؤلی کا ذکر چھیڑ دیتا ہے اور اسطرح اپنی کل مصیبتوں کو بیان کر جاتا ہے

۴ اس بیان میں یہ کنایہ ہے کہ اگر مجھے تیری کوشش سے کسی طرح پھول مل گیا تو میں ابھی ہوا ہوں یعنی تجھسے عقد کر لوں۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ میں ابھی روانہ ہوں یہ فقرے تمام ذو معنی ہیں "محمودا" نے غنچۂ دل کے کھلنے کے لئے "ہوا" کی خواہش کی تھی اسی طرح تاج الملوک نے بھی کنایۃً اسکا وعدہ کیا کہ "میں ہوا ہوں"۔

پیراہنِ گُل کی بو تھی مطلوب | یوسُف نے کہا وہ حال یعقوب
اوّل کبھی بار نگاہی اپنی | بعد اُس کے وہ سب تباہی اپنی
کھولی تھی زبان سنہ اندھیرے | کہتے سُنتے اُٹھے سویرے

حمّالہ اُس سے ملنے کا حال پوچھتی ہے۔ محمودہ تاج الملوک کی بے التفاتی کا ذکر کرتی ہے۔ حمّالہ کو خیال ہوتا ہے کہ تاج الملوک کو کوئی درد یا بیماری لاحق ہے۔ چنانچہ محمودہ سے پوچھتی ہے اور وہ جواب دیتی ہے

بولی وہ کہ ہے تو درد لیکن | تم چاہو تو ہے دوا بھی ممکن
وہ بولی جو تو کہے زباں سے | تارے تو اُتاروں آسماں سے
چہرے کو چھپا کے زیر چادر | محمودہ نے کہا کہ مادر
باپ اسکا ہے اندھے پن سے مجہول | مطلوب بکاؤلی کا ہے پھول
دل داغ اسکا برائے گُل ہے | نرگس کے لئے ہوائے گُل ہے
ساعی تھی بدل یہ کہنے والی | راہ اُس نے سُرنگ کی نکالی
دیوؤں سے کہا کہ چوہے بن جاؤ | تا باغِ ارم سُرنگ پہنچاؤ
سُن حاجتِ نقب بہر گلگشت | کُترا چوہوں نے دامنِ دشت
پوشیدہ زمیں کے دل میں کی راہ | ؁ باندھ کے خوش پھرے اُسی راہ

سلہ حضرت یوسف علیہ السلا حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ یہ دونوں باپ بیٹے پیغمبر تھے۔ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے انکو کنوئیں میں ڈال دیا تھا اسکے بعد اُنکو فروخت کر ڈالا۔ حضرت یعقوبؑ حضرت یوسفؑ کے فراق میں گریہ وزاری کرتے کرتے نابینا ہو گئے تھے۔ ایک مدت کے بعد جب حضرت یوسفؑ کنعاں میں اپنے باپ حضرت یعقوبؑ سے ملنے آئے تو آپنے آنے سے قبل اپنا کُرتا حضرت یعقوبؑ کے پاس بھیج دیا تھا۔ حضرت یعقوبؑ نے حضرت یوسفؑ کے کُرتے کو جب سونگھ کر آنکھوں سے لگایا تو آپ کی آنکھیں فرطِ خوشی سے روشن ہو گئیں۔ تاج الملوک کا باپ چونکہ اندھا تھا اسلئے اُسے یعقوب اور تاج الملوک چونکہ اپنے باپ کا محبوب فرزند تھا۔ اسلئے اُسے یوسف کہا ہے۔

جب مہ تہِ زمیں سمایا　　اُس نقب کی رہ وہ آدم آیا

صحنِ چمنِ ارم میں اک جا　　بوٹا سا تہِ زمیں سے نکلا

کھٹکا جو نگاہبانوں کا تھا　　دھڑکا یہی دل کا کہہ رہا تھا

گوشے میں کوئی لگا نہووے　　خوشہ کوئی تاکتا نہووے

گو باغ کے پاسباں غضب تھے　　خوابیدہ برنگِ سبزہ سب تھے

نرگس کی کھلی نہ آنکھ یکچند　　سوسن کی زباں خدانے کی بند

خوش[1] قد وہ چلا گل وسمن میں　　شمشاد رواں ہوا چمن میں

ایوانِ بکاولی جدھر تھا　　حوض آئینہ دار بام و در تھا

رکھتا تھا وہ آب سے سواتاب　　چندے[2] خورشید و چندے مہتاب

پھول اُسکا اندھے کی دوا تھا　　رشکِ جامِ[3] جہاں نما تھا

پانی کے جو بلبلوں[4] میں تھا گل　　بہنچا لبِ حوض سے نہ چنگل

پوشاک اُتار اُتر کے لایا　　پھولا نہ وہ جامے میں سمایا

گل لیکے بڑھا ایاغ[5] برکف　　چوری سے چلا چراغ برکف

۱؎ گل وسمن اور چمن میں چونکہ تاج الملوک کو شمشاد رواں دکھلانا ہے اسلئے تشبیہہ اور صنعت مراعات النظیر کے لئے اُسے "خوش قد" کہا ہے۔

۲؎ محاورہ ہے۔ مطلب یہ کہ نہایت خوبصورت۔

۳؎ ایران کے بادشاہ جمشید نے ایک پیالہ بنایا تھا جس سے تمام دنیا کے حالات معلوم ہوتے تھے اسلئے اُسکا نام جامِ جہاں نُما تھا

۴؎ گل کی رعایت سے "بلبلوں" کہا ہے۔

۵؎ ایاغ۔ بمعنی شراب کا پیالہ پھول کو ایاغ اور چراغ سے تشبیہہ دی ہے۔ دوسرے مصرع میں فارسی کے اس مصرع کی طرف تلمیح ہے ع چہ دلاورست دزدے کہ بکف چراغ دارد۔

بارہ دری واں جو سونے کی تھی | سو خواب گہِ بکاؤلی تھی
گول اُس کے ستوں تھے ساعدِ حور | چلمن مژگانِ چشمِ مخمور
دکھلاتا تھا وہ مکانِ جادو | محراب سے در سے چشم و ابرو
پردہ جو حجاب سا اُٹھایا | آرام میں اُس پری کو پایا

یہاں پر بکاؤلی کے سونے کی اداؤں کا ذکر ہے۔

سوچا کہ یہ زلف کف میں لینی | ہے سانپ کے مُنہ میں اُنگلی دینی
یہ پھول انھیں اژدہو بکا ہے من | یہ کالے چراغ کے ہیں دشمن
گُل چھپن کے ہنسی نہ ہووے بالکل | خندہ نہ ہو برق حاصلِ گُل
پھر سمجھینگے ہے جو زندگانی | کچھ نام کو رکھ چلو نشانی
انگشتری اپنی اُس سے بدلی | مُہرِ خطِ عاشقی سند لی
آہستہ پھرا وہ سروِ بالا | سایہ بھی نہ اُس پری پہ ڈالا
ہیبت سا زمیں کے دل میں آیا | اندیشے کی طرح سے سمایا
جب نقبِ افق سے مہرِ تاباں | نکلا تو وہ ماہرو شتاباں

---

۱ سونے کی بارہ دری۔ یعنی زریں بارہ دری۔ خوابگاہ کی رعایت سے "سونے کی" کہا

۲ مطلب ہے کہ کہیں وہ گُل چھپن نہ جائے جس سے ہنسی ہو۔ اور یہ ہنسی (خندہ) حاصل گُل کیلئے برق کا کام نہ دے۔

۳ زمین کے دل میں ہیبت اور اندیشہ کی طرح آنا اور سمانا بجائے خود نہایت پُر لطف ہے لیکن اسکے علاوہ اسمیں مصوری شان محاکات بھی ہے۔ اُسوقت ہیبت و اندیشہ کا ایک عالم طاری تھا اس حالت میں آہستہ خاموشی سے نکل چلنے کی ایک تصویر سامنے آجاتی ہے۔

گُل ہاتھ میں مثلِ دستِ بیضا[51] اُس نقب کی آستیں سے نکلا
وہ دیونی اور وہ دختِ انساں دونوں تھیں اُسی کی منتظر واں
گُل لیکے جب آ ملا وہ گُلچیں اُس نقب کی رخنہ بندیاں کیں

آوارہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک گلچیں کی تلاش میں

گُل کا جو الم چمن چمن ہے یوں بلبلِ خامہ نعرہ زن ہے
گُلچیں نے وہ پھول جب اُڑایا اور غنچۂ صبح کھلکھلایا
وہ سبزۂ باغ خواب آرام یعنی وہ بکاؤلی گلِ اندام
جاگی مرغِ سحر کے غل سے اُٹھی نکہت سی فرشِ گُل سے
مُنہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی پُر آب وہ چشمِ حوض پائی
دیکھا تو وہ گُل ہوا[52] ہوا ہے کچھ اور ہی گُل کھلا[53] ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گُل جُھنجلائی کہ کون دے گیا جُل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون ہے ہے مجھے خار دے[54] گیا کون
ہاتھ اُسپہ اگر پڑا نہیں ہے بُو ہو کے تو پھول اُڑا نہیں ہے

---

[51] حضرت موسیٰؑ کا ایک معجزہ تھا کہ آپ کے ایک ہاتھ کی ہتیلی جب آپ مٹھی بند کرکے کھول دیتے تھے تو وہ روشن دکھائی دیتی تھی اُس کو ید بیضا کہتے ہیں۔

[52] ہوا ہونا۔ غائب ہونا۔

[53] کچھ اور ہی گُل کھلا ہوا ہے۔ کچھ اور ہی معاملہ درپیش ہے۔

[54] خار دینا۔ غم میں مبتلا کرنا۔

نرگسؔ تو دکھا کدھر گیا گُل — سوسن تو بتا کدھر گیا گُل

سنبل، مرا تازیانہ لانا — شمشاد، انھیں سولی پر چڑھانا

تھرّائیں خواصیں صورتِ بید — ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید

نرگس نے نگاہبانیاں کیں — سوسن نے زبان درازیاں کیں

پتّا بھی پتے کو جب نہ پایا — کہنے لگیں کیا ہوا خدایا

اپنوں میں سے پھول لےگیا کون — بیگانہؔ نہ تھا سبزہ کے سوا کون

شبنم کے سوا چُرانے والا — اوپرؔ کا تھا کون آنے والا

جس کف میں وہ گُل ہو داغ ہو جائے — جس گھر میں ہو گُل چراغؔ ہو جائے

بولی وہ بکاؤلی کہ افسوس — غفلت سے یہ پھول پر پڑیؔ اوس

آنکھوں سے عزیز گُل مرا تھا — پتلی وہی چشم حوض کا تھا

نام اُسکا صبا نہ لیتی تھی میں — اُس گُل کو ہوا نہ دیتی تھی میں

حاشیہ ۱ نرگس کو آنکھوں سے استعارہ کرتے ہیں اسکی رعایت سے "دکھا" کہا ہے اور سوسن کی تشبیہہ زبان سے دیجاتی ہے۔ اسلئے اسکے لئے "بتا" کا لفظ کہا ہے اسی طرح "سنبل" کے لئے تازیانہ اور شمشاد کیلئے سولی کہا، سنبل تازیانے سے اور شمشاد سولی سے مشابہ ہے نرگس، سوسن، سنبل اور شمشاد صرف پھولوں اور درختوں ہی کے نام نہیں ہیں بلکہ نام خواصوں کے بھی رکھے جاتے ہیں۔

حاشیہ ۲ اصطلاح شعراء میں سبزے کو بیگانہ کہتے ہیں۔

حاشیہ ۳ اوپر کا آنے والا محاورہ ہے۔ بمعنی باہر کا کوئی اجنبی آنے والا۔

حاشیہ ۴ چراغ گُل ہو جانا۔ بمعنی ستیاناس ہو جانا۔

حاشیہ ۵ اوس پڑنا۔ برباد ہو جانا۔

گلچیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا — غنچہ کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا
او خار پڑا نہ تیرا چنگل — مشکیں کس لیں نہ تونے سنبل
او بادِ صبا ہوا نہ بتلا — خوشبو ہی سنگھا پتا نہ بتلا
بلبل تو چہک اگر خبر ہے — گل تو ہی مہک بتا کدھر ہے
لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کہرام — تھی سبزے سے راست مو براندام
انگلی لبِ جو پہ رکھکے شمشاد — تھا دم بخود اسکی نکلے فریاد
جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا — جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا
رنگ اُس کا غرض لگا بدلنے — گل برگ سے کف لگی وہ ملنے
بدلے کی انگوٹھی ڈھیلی پائی — دست آویز اُس کے ہاتھ آئی
خاتم تھی نام کی نشانی — انسان کی دست بُردِ جانی
ہاتھوں کو مُلا کہا کہ ہیہات — خاتم بھی بدل گیا ہے بد ذات
جس نے مجھے ہاتھ ہے لگایا — وہ ہاتھ لگے کہیں خدایا
عریاں مجھے دیکھکر گیا ہے — کھال اُس کی جو کھینچے سزا ہے
یہ کہکے جنون میں غضبناک — خوں روئی، لباس کو کیا چاک
گل کا سا لہو بھرا گریباں — سبزے کا سا تار تار داماں
دکھلا کے کہا سمن پری کو — اب چین کہاں بکاؤلی کو

---

۵۱ گلچیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا۔ یہ عورتوں کے کوسنے کا طریقہ ہے یعنی جس ہاتھ سے اُسنے پھول توڑا وہ ٹوٹ کیوں نہ گیا۔

۵۲ منہ سے کچھ نہ پھوٹا۔ محاورہ ہے یعنی کوئی آواز نہ نکلی۔

۵۳ خاتم۔ انگوٹھی۔

تھی بسکہ غبار سے بھری وہ | آندھی سی اُٹھی، ہوا ہوئی وہ
کہتی تھی پری کہ اُڑکے جاتی | گلچیں کا کہیں پتا لگاتی

ہر باغ میں پھولتی پھری وہ | ہر شاخ پہ جھولتی پھری وہ
جس تختے میں مثل باد جاتی | اُس رنگ[۱] کے گُل کی بو نہ پاتی
بیوقت کسی کو کچھ ملا ہے | پتا کہیں حکم بن ہلا ہے

پہنچنا تاج المُلوک کا ایک اندھے فقیر کے تکیے پر اور آزمانا گُل کا

پھرنا جو وطن کا مدعا ہے | اب صفحے پہ یوں قلم پھرا ہے
وہ گلشنِ مدعا کا گلچیں | یعنی تاج الملوک حق بیں
جس وقت گُل اُس چمن سے لایا | محمودا خوش ہوئی کہ آیا
کہنے لگی لو مُراد پائی | بولا وہ جو یاں سے ہو رہائی

جب دیوِ سیاہِ شب سے مہتاب | رخصت ہوا جیسے چشم سے خواب
اور گُل لئے آفتاب تاباں | ہنگامِ سحر ہوا شتاباں
وہ مہروش اور وہ ماہ پیکر | اُس دیونی پاس آئے مضطر
گُل کی وہ غرض جتائی اُسکو | رخصت کی طلب سُنائی اُسکو
کیا کہتی وہ دیونی کہا جاؤ | دیوؤں سے کہا کہ تخت لے آؤ

---

[۱] اُس رنگ کے گُل کی بو نہ پاتی۔ یعنی اُس طرح کا پھول دکھائی نہ دیتا تھا۔

دو بال دے کہ لو مری لاگ — جب وقت پڑے دکھائیو آگ
دیو اُن کو سریر[1] پر بٹھا کے — پرواز کناں ہوا پہ جا کے
بولے کہ کدھر چلو گے کہدو — فردوس کے رخ، کہا اُدھر کو
وہ مُڑ کے اُدھر کو اُڑ کر آئے — گُلزار میں بیسوا کے لائے
وقتِ سحر اور خنک ہوا تھی — گلگشتِ چمن میں بیسوا تھی
چار آنکھیں ہوئیں تو تھی شناسا — قدموں پہ گری وہ سایہ آسا
صدقے ہو کر کہا خوش آئے — جس گُل کی ہوا لگی تھی لائے
ہمراہ یہ کون دوسری ہے — سایہ ہے کہ ہمقدم پری ہے
بولا شہزادہ شکر ہے ہاں — پُر ہے گلِ آرزو سے داماں
محمودا نام ہیں جو یہ ساتھ — پھول ان کے سبب سے آگیا ہاتھ
جیتا جو پھرا وہ رشکِ شمشاد — قیدی کئے بیسوا نے آزاد
شہزادے نے بھائیوں کے لے نام — بھجوایا برائے داغ پیغام
جھوٹوں اُس نے تھا اُن کو تایا[2] — سچّوں کھوٹوں نے داغ کھایا
داغا تو چلے تفنگ[3] سے وہ — چھوٹے قیدِ فرنگ[4] سے وہ

---

[1] سریر۔ بمعنی تخت

[2] تاج الملوک نے بھائیوں کو آزمانے کے لئے داغ لگائے جانے کا حکم دیا تھا (داغ لگایا جانا قیدی ہونے کی علامت ہے) لیکن وہاں سچ مچ اُنکے داغ لگا دئے گئے۔ جھوٹوں۔ سچّوں میں صنعت تضاد اور "تایا" "کھوٹوں" اور "داغ" میں مناسبت لفظی ہے۔

[3] داغا کی رعایت سے تفنگ (بندوق) لکھا ہے [4] اہل فرنگ کی ایک سخت قید جس سے رہائی دشوار ہوتی تھی۔

چھوڑا ہوسِ گُل و چمن کو — چاروں داغی پھرے وطن کو

بندوں کو کیا جب اُسنے آزاد — آیا لبِ جو وہ رشکِ شمشاد

اسباب کو کشتیوں پہ کر بار — سونپا سب نا خدا کو گھر بار

جب متصل آگیا وطن کے — خن ے یاد آے مرد و زن کے

سوچا کہ میں خود ہوں خانہ برباد — کیا جانئے کیا پڑے گی افتاد

لازم ہے گُل اپنے ہاتھ رکھئے — موقع نہیں بھیڑ ساتھ رکھئے

لنگر کا اُنھیں کیا اشارہ — خود کشتی سے کر گیا کنارہ

وہ پوربی کرکے جوگیا بھیس[1] — جنگلے کی راہ سے چلا دیس

تکئے پہ فقیر پیر اندھا — اک گوشے میں آنکھیں مانگتا تھا

تھا نقشِ قدم سا خاکِ رہ پر — ٹھہرا وہ مسافر اُس جگہ پر

بے تجربہ تھی نمائشِ گُل — واجب تھی آزمائشِ گُل

پتلی پہ زرِ گُل آزمایا — سونے کو کسوٹی پر چڑھایا

گُل سے ہوئی چشمِ کور تاباں — ہو جیسے چراغ سے چراغاں

مُنہ دیکھ کے اُس نے دیں دعائیں — پنجے سے مژہ کی لیں بلائیں[2]

---

[1] پوربی۔ جوگیا، جنگلہ اور دیس راگنیوں کے نام ہیں۔ جوگی چونکہ بھجن وغیرہ گایا کرتے ہیں اور عام طور سے جوگیوں کو ہی موسیقی کا شوق ہوتا ہے۔ غالباً اس خیال سے یا ممکن ہے صرف "جوگیا بھیس" پر لکھنؤ کے مذاق کے موافق اس طرح کا ضلع استعمال کرگئے ہیں

[2] بلائیں لینا۔ یہ رسم آجکل بہت کم ہوگئی ہے ورنہ پہلے فرطِ محبت سے لوگ اس طرح بلائیں لیا کرتے تھے کہ اپنے دونوں ہاتھ جس شخص کی بلائیں لینا ہوں اُسکے سر پر رکھکر پھر اپنے سر پر رکھ لیا کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ جس کے سر پر سے ہاتھ رکھکر اپنے سر پر رکھا گیا ہے اُس کی کل بلائیں اتارنے والے کے سر پر چلی آئیں اسی کو بلائیں لینا کہتے ہیں۔

گُل کے جو اثر سے شادماں تھا گلچیں وہ ہوا سے ہمعناں تھا

ملنا چاروں شہزادوں کا اور چھن جانا گُل بکاؤلی کا تاج الملوک سے اور بینا ہونا چشم زین الملوک کا

ہے بسکہ یہ چرخ جور پیشہ یوں خار رہِ قلم ہے ریشہ

یہ جا کے اسی جگہ پہ ناگاہ آ پہونچے وہ چاروں غول ہمراہ

کہتے تھے کہ واہ رے مقدر کس شکل سے پھر کے جاتے ہیں گھر

کیا رنگ زمانے نے دکھائے گُل لینے گئے تھے، داغ لائے

کس مُنہ سے پدر کے آگے جائیں کیونکر بے پھول مُنہ دکھائیں

ٹھہرائے کہ اور پھول لے جائیں کحال کو بے وقوف ٹھہرائیں

اک بادِ ہوائی[1] توڑ کر پھول کہنے لگے پھول[2] پھول کر غول

کیا پھول ہے کیا اثر ہے اسمیں ہو جاتی ہیں روشن اندھی آنکھیں

وہ کور کہ ہو چکا تھا بینا دیکھا اُس نے جو یہ قرینا

بولا کہ یہ گُل وہ گُل نہیں ہے اُس پھول کی اور گُل زمیں[3] ہے

---

[1] اک بادِ ہوائی۔ یعنی یوں ہی سا معمولی۔ بیکار۔ نکما۔

[2] پھول پھول کر یعنی خوش ہو ہو کر۔

[3] گُل زمیں بسرشت کی جگہ مطلب یہ ہے کہ اُس پھول کی بات ہی اور ہے۔

وہ جوگی جو جاتے ہیں اگر آئیں ‏ ‏ دکھلائیں وہ گُل تو آنکھیں کُھل جائیں[1]

میں کورا بھی ہو چکا ہوں بینا ‏ ‏ اندھا نہیں اب ہوا ہوں بینا

چاروں کو تھی حسرتِ گلِ تر ‏ ‏ چوبائی ہوا[2] کی طرح چل کر

اُس جوگی کے جب برابر آئے ‏ ‏ باہم کہا دیکھو پھول لائے

گُل ہے کہ علاج نور ہے یہ ‏ ‏ گُل ہے کہ چراغ طور ہے یہ

جوگی یعنی وہ شاہزادہ ‏ ‏ بولا کہ بکو نہیں زیادہ

پاتے اگر اُس درخت کی چھاؤں ‏ ‏ رکھتے ہی نہ تم زمیں پر پاؤں

ڈینگ آپ کی سب فضول ہے یہ ‏ ‏ وہ گُل یہ نہیں، وہ پھول ہے یہ

یہ کہکے جو جیب سے نکالا ‏ ‏ اُن مفت بروں نے ہاتھ ڈالا

قوت میں وہ چار تھے یہ بیکس ‏ ‏ شورش میں وہ چار موج یہ خس

غولوں نے بزور پھول اڑایا ‏ ‏ اُس خضر کو راستا[3] بتایا

گل پانے سے بسکہ سُرخرو تھے ‏ ‏ گھوڑوں[4] پہ ہوا کے مثل بو تھے

تعجیل سے روبراہ آئے ‏ ‏ گُل لے کے حضورِ شاہ آئے

ف۱ آنکھیں کُھل جائیں یعنی حقیقت معلوم ہو جائے۔ اسمیں یہ بھی لطف ہے کہ اس پھول سے واقعی آنکھیں کھل جاتی تھیں (یعنی روشن ہو جاتی تھیں)

ف۲ چوبائی ہوا۔ چاروں کی رعایت سے لکھا ہے۔

ف۳ غول یعنی گمراہ ہونے والے۔ خضر کے لئے مشہور ہے کہ وہ بھولے ہوئے کو راستہ بتاتے ہیں یہاں راستا بتانے کا مطلب چلتا کر دینے اور دھتکار دینے کے ہیں۔ غول خضر اور راستہ بتانا سب میں باہم رعایت لفظی ہے۔

ف۴ ہوا کے گھوڑے پر۔ مطلب عجلت اور تیزی سے ہے۔

گُل لائے جو نور دیدہ دلخواہ — آنکھوں کی طرح پھڑک گیا شاہ[۱]
پنجے سے پلک کے پھول اُٹھایا — اندھے نے گُل آنکھوں سے لگایا
نور آگیا چشمِ آرزو میں — آیا پھر آب رفتہ جُو میں[۲]
خورشید بھر گہن سے چھوٹا — خیرات کے در کا قفل ٹوٹا
دولت جو پاس تھی لٹائی — زر بخشا گُل کی رو نمائی
ایک ایک کو اسقدر دیا زر — محتاج گدا ہوئے تونگر
بجوائے طرب کے کارخانے — بجوائے خوشی کے شادیانے

پہنچنا بکاوٗلی کا دار الخلافت زین الملوک میں اور وزیر ہو کر تاجُ الملوک کی تلاش میں رہنا

گُلچیں کا جواب پتا ملا ہے — یوں شاخِ قلم سے گُل کھلا ہے
وہ باد چمن چمن خراماں — یعنی وہ بکاوٗلی پریشاں
گلشن سے جو خاک اُڑاتی آئی[۳] — اُس شہر میں آتے آتے آئی
دیکھا تو خوشی کے چہچہے تھے — گُلچیں کے شگوفے کھل رہے تھے
گلبانگ زناں تھا جو جہاں تھا — ایک ایک ہزار داستاں تھا

۱؎ پھڑک جانا۔ کوئی نہایت عجیب چیز کو دیکھکر خوش ہو جانے کو کہتے ہیں۔

۲؎ آب رفتہ باز بجو آمدن۔ فارسی محاورہ ہے یعنی ناممکن بات کا ہو جانا۔

۳؎ خاک اُڑانا۔ سرگرداں و پریشان ہونا۔

پاتے ہی پتا خوشی سے پھولی — شاد ایسی ہوئی کہ رنج بھولی

جادو سے بنی وہ آدمی زاد — انسانوں میں آ ملی پریزاد

سلطان کی سواری آ رہی تھی — صورت جو نگاہ کی، پری تھی

پوچھا اے آدمِ پری رو — انسان ہے، پری ہے، کون ہے تو؟

کیا نام ہے اور وطن کدھر ہے — ہے کون سا گُل چمن کدھر ہے؟

دی اُس نے دعا کہا بصد سوز — فرّخ ہوں شہا میں ابنِ فیروز

گُل ہوں تو کوئی چمن بتاؤں — غربت زدہ کیا وطن بتاؤں

گھر بار سے کیا فقیر کو کام — کیا لیجئے[۵۱] چھوڑے گاؤں کا نام

پوچھا[۵۲] کہ سبب، کہا کہ قسمت — پوچھا کہ طلب، کہا قناعت

باتوں پہ فدا ہوا شہنشاہ — لایا بصد امتیاز ہمراہ

چہرے سے امیر زادہ پایا — گھر لا کے وزیر اُسے بنایا

نذریں دیئے بندگانِ درگاہ — دستور[۵۳] سے آملے بصد جاہ

دربار میں چاروں شاہزادے — دیکھے تو کھُلے وہ دل کے سادے

چاہا گلچیں کا امتحاں لے — پوچھا کہ نگیں جو لے کہاں لے

بتلانے لگے وہ چاروں ناداں — کوئی یمن اور کوئی بدخشاں

---

۵۱ محاورہ کا مطلب یہ ہے کہ جس جگہ کو چھوڑ دیا اب وہاں سے اپنا کوئی تعلق ظاہر کرنا بیکار ہے۔

۵۲ بادشاہ نے پوچھا کہ گھر سے اسقدر بے تعلقی کا سبب کیا ہے تو فرخ نے جواب دیا کہ قسمت میں یہی لکھا تھا پھر بادشاہ نے پوچھا کہ کس چیز کی خواہش و طلب میں یہ آوارہ گردی اختیار کی تو فرخ نے جواب دیا کہ قناعت کی جستجو ہے یعنی یہ کہ اسے کسی چیز کی طلب نہیں ہے۔ ۵۳ یعنی وزیر اعظم اور رسم و رواج۔

جانا کہ جو گُل یہ لائے ہوتے   خاتم کے نگیں بنائے ہوتے
تجویز میں تھا یہ صاحبِ فکر   آیا تاج الملوک کا ذکر
ظاہر نہ کیا بطون اپنا   طالع سے لیا شگون اپنا
منزل گہِ رہروان بنا کے   شام و سحر اُس میں آپ آکے
رہرو کو دیا بلطف و اکرام   آتے آرام جاتے پیغام

آباد ہونا تاج الملوک کا گُلشن نگارین بنوا کے اور شہرہ ہونا

تعمیر مکاں کے ہیں جو آثار   یوں خامہ ہے بہرِ بیت معمار
شہزادہ کہ عازمِ وطن تھا   گُل پانے سے خوش چمن چمن تھا
اندھے کو کیا جب اُس نے بینا   اور داغیوں نے وہ پھول چھینا
سوچا کہ خوشی خدا کی غم کھاؤ   حمّالہ دیونی کو بلواؤ
نقلِ اِرم اک مکاں بنا کے   رکھو پریوں کو اپنے لاکے
بال آگ پہ رکھتے آندھی آئی   وہ دیونی بال[1] باندھی آئی
تنہا اُسے دیکھ کر کہا، ہیں!   محمودا کیا ہوئیں، کہاں ہیں؟
دریا پہ ہوں اُن کو چھوڑ آیا   مسکن کے لئے تمھیں بلایا
لیکن وہ مکاں وہ حوض وہ باغ   جو باغ بکاؤلی کو دے داغ
حمّالہ نے دیوؤں کو کیا یاد   آئے تو کہا یہ بَن ہو آباد
ویرانے کو گُل زمیں بناؤ   گلزار جواہریں بناؤ

---

[1] بال باندھی آئی ۔ تابع فرمان حاضر ہوئی

صنّاعِ طلسم کار تھے وہ | گُلشن کے لئے بہار تھے وہ
دیوؤں نے اُدھر محل بنایا | کشتی سے وہ دخترِ رز کو لایا
حمالہ اُس کی مادرِ پیر | محمودا سے ہوئی بغلگیر
کچھ دیوؤں کو چھوڑ کر وہیں پر | رخصت ہو کر چلی گئی گھر
گُلشن میں سمن بروں کو لایا | نسرین بدنوں سے گھر بسایا
دیوؤں کو کہا کہ بہرِ تمکیں | آباد ہو گُلشنِ نگاریں
دیو آدمی بن کے بن میں آئے | آتے جاتے کو گھیر لائے
جو سُن کے خبر گیا اُدھر کو | جنّت سے وہ پھر پھرا نہ گھر کو
از بسکہ قریب شہر تھا باغ | خورشید افق نظر پڑا باغ
مفلس، زردار، امیر، قلاش | نوکر تاجر فقیر خوش باش
گھر چھوڑ کے چل بسے سب انساں | پھر تن میں نہ آئے صورتِ جاں

ملاقات ٹھہرنے زین الملوک اور تاج الملوک کی آپسمیں

گُلشن جو بنا جواہر آگیں | یوں صفحۂ قلم سے ہے نگاریں
ساعد نام ایک مہ لقا تھا | دلبر کا غلام باوفا تھا
صحرا سے جو سیر کرکے آیا | لکڑی کے پُچکا کے بوجھ لایا
دلوائے ہر ایک کو پئے قوت[1] | الماس و عقیق و لعل و یاقوت
تھی بسکہ وہ جا خلاصۂ دہر | کچھ ٹھہرے کچھ آئے جانبِ شہر

---

[1] قوت۔ روزی۔

کف میں وہ جو لعل بے بہا تھے — مَن پاتے ہی لوگ اژدھا تھے

شحنے نے سنا پکڑ بلایا — لے کر اظہار ساتھ آیا

دیکھا تو وہ جلوہ گاہ امید — اک دائرہ تھا برنگ خورشید

دروازے پہ دیوؤں کا تھا پہرا — بھجوا کے خبر وہ شحنہ ٹھہرا

جب وہاں سے طلب ہوا تو درباں — لائے اُسے پیش گاہ سلطاں

آداب کیا ادب سے ٹھہرا — ہیبت زدہ دور سب سے ٹھہرا

اُن لوگوں کو لے گیا تھا ہمراہ — معروض کیا کہ یا شہنشاہ

کم مایہ یہ لوگ ہیں بظاہر — چوری کے تو یہ نہیں جواہر

ساعد نے کہا کہ ہے یہ حاسد — نیت ہوئی ہوگی اسکی فاسد

حضرت یہ وہی تو ہیں تبر دار — جا ان سے نہ بولیو خبر دار

پھر کر اُنھیں پاؤں شحنہ بے آس — آیا زین الملوک کے پاس

کی عرض کہ باغ اک بنا ہے — یہ شہر اُجڑا ہے وہ بسا ہے

جو کوئی ہے اُس جگہ پہ جاتا — ڈھیروں ہے جواہرات پاتا

حضرت نے کہا کہ بک نہ خیرہ — قاروں کا وہیں ہے کیا ذخیرہ

۱؎ لعل کو مَن سے اور دشمن کو اژدہے سے تشبیہ دی ہے۔

۲؎ شحنہ بمعنی کوتوال شہر۔

۳؎ اُنھیں پاؤں پھر کر آنا یعنی فوراً ہی واپس آنا۔

۴؎ قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں ایک نہایت مالدار شخص تھا جو حضرت موسیٰ کی بددعا سے زمین میں دھنس گیا یہاں اُسکی دولتمندی کی طرف اشارہ ہے۔

فرخ کہ وزیر باخرد تھا — سلطاں کا مشیر نیک و بد تھا
بولا کہ شہا یہ بات کیا ہے — نیرنگ و فسوں کا گھر بڑا ہے
ہر چند کہ طرفہ حال ہے یہ — کچھ دور نہیں مثال ہے یہ

حکایت ایک عورت کے مرد بن جانے کی دیو کے جادو سے

اک ملک میں ایک صاحبِ فوج — رکھتا تھا محل میں بارور زوج[1]
تھا داغ پسر مقدر اُس کو — جنتی تھی ہمیشہ دختر اُس کو
از بسکہ وہ شاہ تھا بد اختر — کرتا تھا حسد سے قتلِ دختر
اک بار محل میں پھر حمل تھا — وہ شاہ کہ ظلم میں مثل تھا
کھا بیٹھا قسم کہ ابکی باری — بیٹا جو نہ دے جناب باری
اقبال کا کچھ نہ جانئے اَوج — کر ڈالئے ذبح دختر و زوج
کنیا[2] تھی غرضکہ راس اُسکی — پوری نہ ہوئی وہ آس اُسکی
سلطاں کا جو عہد بے خلل تھا — گھر والوں کو خوف کا محل تھا
ملحوظ بدل تھا پردۂ راز — ستارہ شناسوں سے کیا ساز
ہر چند ستارہ ماں کا تھا ماند — تھی[3] چاندنی شہرہ کر دیا چاند
پھر اہلِ نجوم محرم راز — بانوئے ملک سے ہو کے دمساز

---

[1] زوج جوڑے کو کہتے ہیں جو شوہر اور بیوی دونوں کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن بارور زوج کا مفہوم صرف حاملہ بیوی سے ہے۔

[2] ۔ کنیاں لڑکی کو کہتے ہیں اور چھٹی راس یعنی برج سنبلہ کا بھی نام ہے کنیا راس والے کو اکثر پست و ناکام بھی کہتے ہیں۔ [3] ۔ یعنی لڑکی تھی مگر مشہور کر دیا کہ لڑکا ہوا۔

بیٹے کا وہ زائچہ بنا کے — گویا ہوئے دست بستہ آ کے

حضرت یہ پسر ہے نیک اختر — بدیمن[۱] مگر ہے ایک اختر

جبتک نہ چلے یہ اپنے پاؤں — حضرت نہ پسر کے سامنے ہوں

حیلہ کر کے چھپا کے یکچند — بیتاب ہوا جب آرزومند

وہ گندم[۲] جو نما تھی بالی[۳] — مردانہ لباس سے نکالی

خوش ہو کے پدر نے بہر شادی — ٹھہرائی کہیں کی شاہزادی

بن ٹھن کے عروس شکل داماد — شادی کو چلی بجانِ ناشاد

اک شب کسی دشت میں تھے ڈیرے — اور روزِ نکاح تھا سویرے

خیمے سے وہ بیقرار نکلی — اُس چھاؤنی سے مثلِ خار نکلی

دیکھا تو اندھیری رات سنسان — اک عالم ہو ہے اور بیابان

اک دیو وہاں پہ گشت میں تھا — جویائے شکار دشت میں تھا

دیکھا تو کہا خضر ملے آؤ — مُنہ کھولو عدم کی راہ بتلاؤ

بولا وہ کہ سُن تو آدمی زاد — کیوں تنگ ہے جی سے کیا ہے بیداد

اے مرد خدا خدا کی سوگند — کہہ جس لئے ہو تو آرزومند

دیو کو معلوم ہو گیا کہ یہ لڑکی ہے اور اب وہ اُس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے

---

۱ منحوس۔

۲ کوئی بات اصلیت کے خلاف ظاہر کرنے کو گندم نمائی و جو فروشی کہا جاتا ہے چونکہ لڑکی کو لڑکا ظاہر کیا گیا اسلئے یہ محاورہ استعمال کیا گیا۔

۳ بالی۔ ہندی لفظ ہے بمعنی لڑکی۔ گندم اور جو کی رعایت لفظی کے لحاظ سے بجائے لڑکی "بالی" نظم کیا گیا ہے۔

خاطر[1] تری ے طلسم دکھلاؤں | تو مجھ سی ہے میں تجھ سا بن جاؤں
موند آنکھ کہا، تو موند لی آنکھ | کھول آنکھ کہا، تو کھول دی آنکھ

لڑکی مرد بن گئی اور دیو عورت ہو گیا

اب یاں سے ہے قصہ مختصر طول | فرخ کہ وہ تھا وزیر معقول
بولا کہ شہا جو یہ ہوا ہے | اس بات کا پھر وجود کیا ہے
شہ نے کہا سُن وزیر دانا | بے دیکھے سُنے کو کس نے مانا
یاد آئی مجھے بھی اک روایت | یہ کہکے بیان کی حکایت

حکایت نصیحت گری مُرغِ اسیر اور نافہمی صیاد کی

اک مُرغ ہوا اسیر صیاد | دانا تھا وہ طائر چمن زاد
بولا جب اُس نے باندھے بازو | کُھلتا نہیں کس طمع پہ ہے تو
بیچا تو ٹکے کا جانور ہوں | گر ذبح کیا تو مشتِ پر ہوں
پالا تو مفارقت ہے انجام | دانا ہو تو مجھسے لے مرے دام
بازو میں نہ تو مرے گرہ باندھ | سمجھاؤں جو پند اُسے گرہ باندھ[2]
سُن کوئی ہزار کچھ سنائے | کیجئے وہی جو سمجھ میں آئے
قابو ہو تو کیجئے نہ غفلت | عاجز ہو تو ہارئے نہ ہمّت
آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجے | جاتا ہو تو اُس کا غم نہ کیجے

---

[1] یعنی اچھا تیری خاطر ہے۔ لے تجھے طلسم دکھاتا ہوں۔

[2] گرہ باندھ۔ یاد رکھ۔

طائر کے یہ سن کلام صیاد — بن داموں[1] ہوا غلام صیاد

بازو کے جو بند کھول ڈالے — طائر نے تڑپ کے پر نکالے

اک شاخ پہ جا چہک کے بولا — کیوں پر مرا کیا سمجھ کے کھولا

ہمت نے مری تجھے اُڑایا[2][3] — غفلت نے تری مجھے چھڑایا

دولت نہ نصیب میں تھی تیرے — تھا لعل نہاں شکم میں میرے

دیکر صیاد نے دلاسا — چاہا پھر کچھ لگائے لاسا[4]

بولا وہ کہ دیکھکر کیا جعل — طائر بھی کہیں نگلتے ہیں لعل

ارباب غرض کی بات سن کر — کر لیجئے یک بیک نہ باور

فرخ یہ وہی مثل نہ ہوئے — دیکھ آ جو تجھے دہل نہ ہووے

مشتاق تو تھا چلا وہ دستور — دکھلائی دیا وہ بقعۂ نور

نقشے میں وہ گلشن نگاریں — گلزار ارم سے تھا خوش آئیں

حیرت تھی کہ یہ طلسم کیا ہے — پردیس میں ہوں کہ گھر مرا ہے

اس سوچ میں تختگہ تک آیا — حیراں وہ وزیر شہ تک آیا

آداب اک کر کے حسب دستور — ٹھہرا تو وہ پادشاہ مسرور

---

[1] بن داموں غلام۔ بندۂ بے درم۔ بیحد مطیع و گرویدہ ہونا۔

[2] یعنی اُڑا۔

[3] اُڑایا۔ مطلب یہ کہ دھوکا دیا

[4] لاسا۔ ایک لسدار مسالا ہوتا ہے جس سے چڑیاں پکڑتے ہیں۔ یہاں مطلب یہ ہے کہ پھر اسکو پھانسنے کی تدبیر شروع کی۔

سمجھا کہ حسین آدمی ہے — کیا جانے کہ خود بکاؤلی ہے
پوچھا کہ کدھر سے آئے کیا نام — بولا وہ کہ نام سے ہے کیا کام
انسان ہوں بندۂ خدا ہوں — بھیجا زین الملوک کا ہوں
گستاخی معاف آپ آئے — بن گھیر لیا مکاں بنائے
بہکا کے بسائے مردمِ شہر — حضرت کا بڑا ہے آپ پہ قہر
دعویٰ یہ ہے یاں زمین دابی — آبادی میں آئی ہے خرابی
خیر اب بھی رفعِ شر جو چاہو — سر آنکھوں سے چل کے جبہ سا ہو
بولا وہ کہ فتنہ گر نہیں ہم — شر جن سے ہو وہ بشر نہیں ہم
درویشی میں دل کے بادشا ہیں — مسند کے تکیے پر گدا ہیں
دستور کہ عرض کر چکا تھا — مثلِ[1] دلِ بدگماں رکا تھا
بولا چلو صلح درمیاں ہو — باہم مہ و مہر کا قِراں ہو
بولا وہ فقیر کی بلا[2] جائے — مشتاق جو ہو وہ شوق سے آئے
بولا وہ کہ خیر تا بفردا — اُٹھ جائیگا درمیان سے پردا
یہ کہکے پھرا وزیر آیا — پہنچا تو وہ شہر خالی پایا
شہزادہ و شہ محل میں تھے واں — برہم زدہ بزم کے چراغاں
شہ نے جو وزیر آتے دیکھا — فرخ فرخ پکار اُٹھا
سلطاں کے نثار ہو کے دستور — بولا کہ بلائے شاہ ہو دور

---

[1] جس طرح بدگمان آدمی کا دل تذبذب کی حالت میں رُکا ہوتا ہے اُسی طرح وزیر رُکا ہوا تھا۔

[2] بلا جائے۔ محاورہ ہے مطلب یہ ہے کہ فقیر نہیں جائیگا۔ یعنی میں نہ جاؤنگا۔

دیکھ آیا میں وہ مکانِ یاقوت
ہے معدنِ لعل و کانِ یاقوت
تختہ ہے زمردیں کہ مینو
گلشن ہے جواہریں کہ جادو
نقشہ کہوں کیا نگار خانہ
جادو کا تمام کار خانہ
دیوؤں کی بنائی ہے وہ بنیاد
رہنے والے ہیں آدمی زاد
واں صاحبِ تاج و تخت جو ہے
درویش ہے شاہ نام کو ہے
دیو اُسکے عمل میں آگئے ہیں
جادو کے محل بنا گئے ہیں
کل آپ بھی چل کے کیجئے سیر
وعدہ کر آیا ہوں کہا خیر

بھید کھلنا چھپے ہوؤں کا ایک ایک پر

اب خامے سے وا شگاف یوں ہے
دل ملنے کی راہ صاف یوں ہے
فرخ جو گیا تو شاہزادہ
سوچا کہ ہوں ٹھاٹھ کل زیادہ
رکھا آتش پہ دوسرا بال
حاضر ہوئی دیونی قوی بال
دعوت کی اُسے خبر سُنائی
دیوؤں کے رُخ اُس نے آنکھ اُٹھائی
ہمچشموں نے چیتوں اُسکی تاڑی
پلکوں سے زمین بن کی جھاڑی
غولوں سے جو تھا بھرا بیاباں
پھولوں سے بنا دیا خیاباں
صناعی اُنھوں نے رات بھر کی
مشتاق نے واں وہ شب سحر کی
بجتے ہی گجر وہ شاہ ذیجاہ
چاروں شہزادے لیکے ہمراہ
جو جو اُمرا تھے سب بُلا کے
فرخ کو خواصی میں بٹھا کے

مشرق سے رواں ہوا دلاور / جس طرح اُفق سے شاہِ خاور

بجلی سے جو زرق برق آئے / فرش ابر کی طرح بچھتے پائے

دیکھا تو[1] تمام دشت گُلزار / دائیں بائیں دو رستہ بازار

شہ کہتا تھا دشتِ پُرخسک تھا / فرخ کہتا تھا کل تلک تھا

غافل تھے کہ سبز باغ[2] ہے یہ / اپنے ہی جگر کا داغ ہے یہ

تجویز رہے تھے سب کے سب دنگ / جادو، افسوں، طلسم، نیرنگ

اتنے میں سُنا کہ صاحبِ تاج / جتنا بڑھے پیچھے سب ہو تاراج

کیا لشکری اور کیا شہنشاہ / سنّاٹے میں تھے کہ اللہ اللہ

دیکھے جو جواہرات کے ڈھیر / سب من کی ہوس سے ہوگئے سیر

شہزادے نے آمد اُن کی پائی / کی تا درِ خانہ پیشوائی

دونوں میں ہوئیں جو چار آنکھیں / دولت[3] کی کُھلیں ہزار آنکھیں

ایوان جواہریں میں آئے / الماس کے شہ نشیں ہیں آئے

وہ چتر کے زیر سایہ بیٹھے / افسر سب پایہ پایہ بیٹھے

جو جو کہ تواضعات ہیں عام / ے آئے خواص نازک اندام

چکنی ڈلی، عطر، الائچی، پان / نُقل و مے و جام و خوانِ الوان

رغبت سے اُنھیں کھلا پلا کے / بولا شہزادہ مُسکرا کے

---

[1] پنڈت برج نراین چکبست نے لفظ "تو" میں تحریف بتائی ہے اور "تو" کے بجائے "تھے" بتایا ہے۔ اور کہا ہے کہ مصرع یوں ہے
دیکھا تو تمام بن ہے گُلزار۔

[2] سبز باغ۔ دھوکھا یا فریب نظر۔

[3] طرح طرح کے قیمتی ساز و سامان نظر آنے لگے۔

اِس تاج شہی میں کے نگیں ہیں ۔ کے نام و نشان دل نشیں ہیں
سلطان نے کہا بصد لطافت ۔ یہ چار ہیں عنصر خلافت
اک اور ہوا تھا قابلِ چشم ۔ وہ نور بصر تھا دشمنِ چشم
جب لائے یہ گُل بکاؤلی کا ۔ نکلا تب خار روشنی کا
پوچھا اُس نے وہ اب کدھر ہے ۔ سلطاں نے کہا کہ کیا خبر ہے
پوچھا شہزادے نے کہ یا شاہ ۔ صورت سے ہے اُسکے کوئی آگاہ
اک اُن میں سے چشم آشنا تھا ۔ کوکا اُسی شاہزادے کا تھا
بولا کہ حضور ادھر تو دیکھیں ۔ دیکھا تو کہا مری نظر میں
صورت وہی رنگِ رو وہی ہے ۔ لہجہ وہی گفتگو وہی ہے
یہ سُنتے ہی اُس نے خندہ کرکے ۔ سر پاؤں پہ رکھدیا پدر کے
سر قدموں سے شاہ نے اُٹھایا ۔ فرزند کو چھاتی سے لگایا
لے لے کے بلائیں کاکلوں کی ۔ پیشانی چومی پیٹھ ٹھونکی
عرض اُس نے کیا کہ دو پرستار ۔ پابوسیِ شہ کی ہیں طلبگار
حضرت نے کہا بلائیے خیر ۔ اُٹھ جائیں جو بیٹھے ہوں یہاں غیر
شہزادے نے اک مکاں بتایا ۔ ایک ایک اُٹھا اُدھر کو آیا
سب اُٹھ گئے پر وہ چاروں باغی ۔ بیٹھے رہے فرشِ گُل پہ داغی
شہزادہ اُٹھا محل میں آیا ۔ پردے تلک اُن کو ساتھ لایا

---

۱ یعنی کے شہزادے ہیں۔

۲ دودھ پلائی کے لڑکے۔ یعنی رضائی بھائی کو کوکا کہتے ہیں۔

دلبر سے کہا میں جب کہوں آؤ | تو کہیو یہ چاروں داغی اُٹھواؤ
در پردہ سکھا کے باہر آیا | بے پردہ حضور شہ بلایا
دلبر نے کہا نہ جاؤنگی میں | قربان گئی نہ آؤنگی میں
اُٹھ جائیں یہ چاروں سست بنیاد | داغے ہوئے ہیں غلام آزاد
چاروں کا یہ سنتے ہی اُڑا رنگ | یکبارگی شاہ ہوگیا دنگ
دکھلائی دئے جو بیٹے بے رُخ | دیکھا تاج الملوک کے رُخ
وہ جبل وہ ہار وہ غلامی | وہ گھات وہ جیتنا تمامی
وہ دسترس اور وہ پایمردی | وہ بیکسی اور وہ دشت گردی
وہ دیو کی بھوک اور وہ تقریر | وہ حلوے کی چاٹ اور وہ تحریر
وہ سعی وہ دیونی کی محبت | محمودا کی وہ آدمیت
تجویز کے وہ سرنگ کی راہ | اور موش دوانیاں وہ دلخواہ
وہ سیر چمن وہ پھول لینا | وہ عزم وطن وہ داغ دینا
وہ کور کے حق میں خضر ہونا | وہ غولوں سے ملکے پھول کھونا
وہ بال کو آگ کا دکھانا | وعدے پہ وہ دیونی کا آنا
وہ نزہتِ گلشنِ نگاریں | وہ دعوت بادشہ وہ تمکیں
گزرا تھا جو کچھ بیاں کیا سب | پنہاں تھا جو کچھ عیاں کیا سب
پہلے تو بہت وہ مُنہ چڑھے ڈھیٹ | آخر داغی دکھا گئے پیٹھ

سلہ گھبراہٹ میں رنگ متغیر ہوگیا۔

سلہ۲ پیٹھ دکھانا۔ شکست کھا کر چلے جانا۔

اُٹھوا کے اُنھیں وہ دو خوش آئیں — پابوسیٔ شہ کو سر سے آئیں[1]

حضرت نے سمجھ کے حُسن خدمت — دونوں کو دیئے خطاب و خلعت

نذریں اُن دونوں نے دکھائیں — رخصت ہو کر محل میں آئیں

مسند سے شہ اُٹھ کے بے محابا — بولا بیٹے سے جانِ بابا

روشن کیا دیدۂ پدر کو — مادر کے بھی چل کے آنسو پوچھو

مشتاق کو رو براہ پایا — ہمراہ اُسے تا بجنانہ لایا

ماں نے دیکھا جو وہ دلاور — اشکوں کے گہر کیئے نچھاور

وہ طفل[2] بھی گر پڑا قدم پر — مانند سرشکِ چشم مادر

ہر خویش و یگانہ سے ملا وہ — پھر اپنی جگہ پہ آگیا وہ

غائب ہو جانا فرخ یعنی بکاؤلی کا اور بلوانا تاج الملوک کو گلشن نگاریں سے اور متفق ہو کر گلزار ارم میں رہنا

کھلنے پہ جو ہے طلسم تقدیر — اب خامے نے یوں کیا ہی تحریر

فرخ وہ بادشا کا دستور — یعنی وہ بکاؤلی مستور

مطلوب کا سُن سمجھ کے سب حال — چاہی کہ نکالے کچھ پر و بال[3]

---

[1] سر سے آنا۔ بدل و جان ادب سے آنا۔ پورا محاورہ بسر و چشم ہے۔

[2] شعرا کی اصطلاح میں آنسوؤں کو طفل سے بھی استعارہ کرتے ہیں۔ یہاں یہ رعایت بھی ملحوظ ہے۔

[3] پر و بال نکالنا۔ کوئی تدبیر کرنا۔

سوچی کہ دلا شتاب کیا ہے — پھر سمجھینگے اضطراب کیا ہے
اُس وضع کا پاس کر گئی وہ — تغیرِ لباس کر گئی وہ
فرخ کہنے تک آدمی تھی — پھر وہ ہی بکاؤلی پری تھی
غربت سے چلی، وطن میں آئی — صحرا سے اُڑی، چمن میں آئی
پژمردہ خواصوں میں پڑی جان — صدقے ہوئی کوئی کوئی قربان
اُس غنچہ میں اک سمن پری تھی — وہ ہمنفسِ بکاؤلی تھی
بولی کہو کیا کیا، کہا خوب — بے کچھ کئے پھر بھی آئے کیا خوب
مانگا کاغذ دوات خامہ — لکھا گلچیں کے نام نامہ
اے[۵۱] یوسفِ چشم زخم یعقوب — وی رشک برادران منکوب
اے دلبرِ[۵۲] دلبرِ دغا باز — وے دیو سوار عرش پرواز
اے آبِ تہ زمینِ نیرنگ — وے نقب دوانِ باغ گلرنگ
اے پردہ کشائے بے حجابی — وے وزد حنائے دستیابی
اے رہروِ رُو بہ رہ نہادہ — وے صرصرِ گل بباد دادہ
اے بے سروبرگ گلشن آرا — وے لعل نمائے سنگِ خارا
اے بے خبرِ طلسم صورت — وے بے بصرِ رُخِ ضرورت
اے باعثِ عزم میزبانی — وے صاحبِ بزم مہربانی
اے آئینہ دار خود نمائی — وے سرمۂ چشمِ آشنائی

---

۵۱ اس خط کے القاب میں اُن تمام واقعات کو جو تاج الملوک کو پیش آئے تھے کنایتہً ظاہر کر دیا ہے۔

۵۲ طنزاً شہزادہ کو دلبر کا معشوق کہا ہے۔

اے پردہ کشائے روئے پنہاں
وے داغ نمائے پشت اخواں

تو باغِ ارم سے لے گیا گُل
تو مجھ سی پری کو دے گیا جُل

بے رُخ ترے واسطے ہوئی میں
فرخ ترے واسطے ہوئی میں

تجکو ترے باپ سے ملا یا
مجکو یہ ملا کہ تجھکو پایا

جو جو اسرار تھے نہانی
سب تجسے سنے تری زبانی

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے
جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے[۵۱]

چاہا تھا کروں سرے سے پامال
کر شکر سمجھ کہ تھا خوش اقبال

کیا کہیئے کہ صورت اور کچھ تھی
وقت اور ضرورت اور کچھ تھی

اب تک ہیں وہ خارجی کے جی میں
جلد آکہ ہے مصلحت اسی میں

آئیگا تو در گزر کروں گی
ورنہ میں بہت ساشر کروں گی

داغوں پہ دئے ہیں داغ تونے
دکھلائے ہیں سبز باغ تونے

کانٹوں[۵۲] میں اگر نہ ہو اُلجھنا
تھوڑا لکھا بہت سمجھنا

پھر خط کی نہ ہو امیدواری
القط ہے قلم کی دوستداری

یہ لکھکے کہا سمن پری کو
چالاک ہے تو ہی قاصدی کو

یہ خط یہ انگوٹھی لے ابھی جا
پورب کے سمت کو چلی جا

رستے میں ہے گلشنِ نگاریں
رہتا ہے وہیں مرا وہ گلچیں

خاتم کی نشاں سے نامہ دیجو
ٹھہری رہیو جواب لیجو

---

۵۱ اس مصرعے نے اب مثل کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جسکا راز ہو وہ خود ہی اپنا بھید ظاہر کر دے۔

۵۲ کانٹوں میں اُلجھنا۔ مصیبت میں پڑنا۔

خط خاتم لے کے وہ ہوائی[1] پتّا ہوئی اور پتے پہ آئی

وہ باغ کہ تھا جواہر آگیں ثابت ہوا گلشنِ نگاریں

وہ آدم حور وش پری رو یعنی تاج الملوکِ خوشخو

گلگشت میں تھا کسی روش پر محمودا دائیں، بائیں دلبر

قاصد نے جو رُخ پری[2] دکھایا دھیان اُس کو بکاؤلی کا آیا

پہچانتے ہی نگینِ خاتم بے شبہہ ہوا یقین کا عالم

پرتو پہ وہ یوں چلا تڑپ کے انگارے پہ جیسے کبک لپکے

دھوکا تھا فقط بکاؤلی کا قاصد نے دیا وہ خط پری کا

گو سرمۂ[3] خموشی نے کھلایا تحریر کو آنکھوں سے لگایا

قاصد سے کلام لطف بولا خط صورت چشم شوق کھولا

وہ نامہ کہ عنبریں رقم تھا قسمت کا نوشتہ یک قلم تھا

---

[1] اُڑنے والی۔

[2] پنڈت برج نراین چکبست کے ایڈیشن میں یہ مصرع اس طرح ہے ع قاصد نے رُخِ پری دکھایا لیکن نظامی پریس کے نسخے میں ہے کہ ع قاصد نے جو رُخ پری دکھایا۔ رُخِ پری کے معنی پری کا چہرہ ہوگا۔ لیکن اردو میں پری کے معنی خوبصورت کے بھی ہیں مثلاً جلال کا شعر ہے ؎

مشاطہ لے کیوں نہ بلائیں تری مشاطہ کیساتھ زلف سے مانگ پری مانگ سے بہتر گیسو

[3] مسلمات شعرا میں یہ ہے کہ سرمہ کھانے سے انسان گونگا ہو جاتا ہے کہتے یہ ہیں کہ خاموشی نے گویا اُسے سرمہ کھلایا یعنی وہ خاموش ہو گیا لیکن تحریر (یعنی بکاؤلی کے خط) کو آنکھوں سے لگایا۔ خموشی کی رعایت سے گو۔ سرمہ کے مناسبت سے "تحریر" اور "آنکھوں سے لگایا" استعمال کیا ہے۔

تحریر تھی سرگذشت ساری ‏ ‏ کچھ یاس تھی کچھ امیدواری

منگوا کے وہیں دوات و خامہ ‏ ‏ تحریر کیا جوابِ نامہ

اے شاہ ارم کی دستِ گلفام ‏ ‏ فرخ لقب و بکاؤلی نام

اس نام کے اس لقب کے صدقے ‏ ‏ اس نامے کے اس طلب کے صدقے

میں نے جو غرض سے جی چُرایا ‏ ‏ تو نے کیوں آکے مُنہ چھپایا

میری جو بدی[1] ہوئی تھی کچھ یوں ‏ ‏ تو نیک تھی بے ملے گئی کیوں

تو جائے تو کیوں نہ آئے افسوس ‏ ‏ افسوس، افسوس، ہائے افسوس

تقدیر پھری پھری نہیں تو ‏ ‏ اُمید گئی گئی نہیں تو

اے کاش میں کچھ بھی سانس[2] پاتا ‏ ‏ جی کھول کے داغ دل دکھاتا

معلوم تو ہے کہ شوق کیا تھا ‏ ‏ جو کھینچ کے یہاں سے لے گیا تھا

اب مجھ میں وہ دم ابھی کہاں ہے ‏ ‏ وہ دل، وہ جگر، وہ جی کہاں ہے

مر جاؤں اگر طلب میں تیری ‏ ‏ میں کیا کہ خبر نہ پہنچے مری

قابل وہاں آنے کے کہاں ہوں ‏ ‏ یہاں بھی جو رہا تو نیم جاں ہوں

تجھسے مری خاطر اب کہاں جمع ‏ ‏ تو بسترِ شعلہ میں رگِ شمع

تو برق دماں میں خرمنِ خار ‏ ‏ تو سیل رواں میں خستہ دیوار

تو جوششِ یم ہیں مور بے پر ‏ ‏ میں نقشِ قدم، تو بادِ صرصر

دھڑکا ہے یہی تو جان دوں گا ‏ ‏ مر جاؤں گا اب نہ میں جیوں گا

---

[1] بدی کی رعایت سے دوسرے مصرع میں نیک کا لفظ ہے۔ پہلے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ میری قسمت ہی میں یہ تھا۔

[2] سانس پانا۔ موقع پانا۔

ہو تجھسی پری جو خصم جانی — انساں کی ہے مرگ زندگانی
منظور جو ہو حیات میری — تو مان لے ایک بات میری
حمالہ کو بھیج آ کے لیجائے — شاید مجھے زندہ پا کے پہنچائے
بھیجا نہ اُسے تو جان لینا — آسان ہے یہاں بھی جان دینا
یہ لکھکے جو خط سے ہاتھ اُٹھایا — قاصد نے لیا جواب لایا
مطلوب کا خط وہ پڑھ رہی تھی — دیکھا تو وہ دیونی کھڑی تھی
پوچھا کہ ارے تجھے خبر ہے — گلچیں مرا کون سا بشر ہے
وہ صدقے ہوئی کہا بلا لوں — بے دیکھے کسی کا نام کیا لوں
یہ سُن کے وہ شعلہ ہو بھبھوکا — بولی کہ تجھے لگاؤں لوکا
تیرا ہی تو ہے فساد مُردار — داماد کو گُل دیا، مجھے خار
گُل نقب کی راہ لے گیا چور — زندہ کروں اس موئے کو درگور
حمالہ جلی ہوں کیا کہوں میں — داماد کو لا تو ٹھنڈی ہوں میں
آگاہی جو دیونی نے پائی — بگڑی ہوئی بات یوں بنائی
محمودا ہے اک کنیز زادی — انسان سے ہوئی ہے اسکی شادی
میرا تو نہیں قصور ہے کچھ — شاید اُس کا فتور ہے کچھ
مجرم جو وہ ہے تو لو میں لائی — یہ کہکے اُٹھی چلی ہوائی
آئی تو یہ زار نیم جاں تھا — آپ اپنی قضا کا نوحہ خواں تھا
حمالہ کو دیکھتے ہی رو رو — پوچھا کہ تو لینے آئی مجھکو

لہ بھبھوکا ہونا۔ سخت غصہ ہونا۔

بولی وہ بنے بگاڑ کیا ہے — چل دیکھ تو چھیڑ چھاڑ کیا ہے

کچھ بول کے زیرِ لب وہ دل زار — ہیجان میں تپ کے جیسے بیمار

لرزا سا چڑھا جو دیونی پر — مانند حواس اڑی وہ مضطر

اُس سمت سے پہنچی یہ عقیلہ — واں آئی پری کی ماں جمیلہ

شکوہ کرنے لگی پری سے — یوں کہنے لگی بکاؤلی سے

گلزار کی سیر خوب بھائی — برسوں سے نہیں تو گھر بھی آئی

بے طرح گلوں کی ہے تو شیدا — گلچیں نہ ہوا ہو کوئی پیدا

کھلتے ہیں کچھ انتظار کے طور — رخ میری طرف نظر کہیں اور

مادر کے کلام سُنکے دختر — بولی کہ چمن تو ہے مرا گھر

میں کیا جانوں، مجھے خبر کیا — رُخ کس کو کہتے ہیں، نظر کیا؟

---

۱۷ اگر شعر کے معنی یہ لئے جائیں کہ حمالہ نے کہا کہ وہ (یعنی بکاؤلی) اگر من جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ چل کے دیکھ یہ کیسی چھیڑ چھاڑ ہے تو "بنے" کے معنی "رضامند" ہونے کے اور "بگاڑ کیا ہے" کا مطلب "کیا مضائقہ ہے" سمجھا جائیگا۔ لیکن ان معنوں میں ایسی کھینچ تان ہوتی ہے کہ زبان اور محاورہ کو سخت صدمہ پہنچتا ہے پھر بھی بات ویسی ہی الجھی کی الجھی رہجاتی ہے۔ اگر یہ مطلب سمجھا جائے تو اس سے یقیناً زیادہ صاف ہوگا۔

حمالہ چونکہ محمودہ کی منہ بولی ماں ہے اور محمودہ تاج الملوک کے عقد میں ہے اس لئے وہ (حمالہ) اُسے "بنے" (یعنی دولھا) کرکے مخاطب کرتی ہے اور کہتی ہے۔ کہ (اے) بنے یہ کیسی لڑائی چھڑی ہوئی ہے۔ چل دیکھ تو یہ کس قسم کی چھیڑ چھاڑ ہے۔

اس مفہوم میں نہ کوئی قباحت لازم آتی ہے اور نہ "بنے" اور "بگاڑ" میں جو مناسبت لفظی ہے وہ ضایع ہونے پاتی ہے۔

تقریر جو بھولے پن کی پائی — وہ سادہ دل اُٹھ کے گھر کو آئی

جب اُٹھ گئی یہ تو دیونی وہ — حاضر ہوئی لے کے آدمی وہ

آئے تو وہ منتظر تھی خونخوار — اندیشہ سے کانپ اُٹھا گنہ گار

واں غصہ بھری غضب وہ چتون — پلکوں سے یہاں نظر پہ چلمن

واں سرمۂ چشم گرم تسخیر — یاں قطرۂ اشک تر گلو گیر

واں پھانسنے کو بلا وہ گیسو — یاں تابِ سخن نہیں سر مو

بولی وہ پری بصد تامل — کیوں جی تمھیں لگتے تھے وہ گل

کیا کہتی ہوں میں ادھر تو دیکھو! — میری طرف اک نظر تو دیکھو!

ہے یا نہیں یہ خطا تمہاری — فرمائیے[1] کیا سزا تمہاری

قابو میں پری کے تھا سلیماں — بولے بتلائے کیا پشیماں

کی عرض رضا ہے جو خوشی ہو — عاشق کی سزا جو پوچھتی ہو

مشکیں زلفوں سے مشکیں کسواؤ — کالے ناگوں سے مجکو ڈسواؤ

تلوار سے قتل ہو جو منظور — ابرو کے اشارے سے کرو چور

زنداں میں جو زندہ بھیجنا ہو — اپنے دلِ تنگ میں جگہ دو

یہ سُنکے وہ شوخ مُسکرا کے — بولی اُسے چھاتی سے لگا کے

گلچیں تو فقط نہیں چمن کا — محرم ہے سارے تن بدن کا

رُخ دیکھ چکی ہوں اب ترا میں — مُنہ دوسرے کو دکھاؤں کیا میں

---

[1] بظاہر "تمہاری" کے ساتھ "فرمائیے" میں تنتر گربہ معلوم ہوتا ہے لیکن اکثر غصہ کی حالت میں مخاطب کیلئے طنزاً تعظیمی الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں مثلاً آپ جناب، اُسی حیثیت سے "فرمائیے" بھی ہے اور اسطرح حالت غیظ و غضب کی صحیح مصوری کی گئی ہے۔

اس کے بعد تاج الملوک اور بکاؤلی کی یکجائی کا ذکر ہے

افشائے راز ہو کر پھنسنا تاجُ الملوک کا طلسم میں اور مقیّد رہنا بکاؤلی کا

لکھتے ہیں کہ قلم اب یوں حال تحریر کرتا ہے

از بسکہ یہ عشق فتنہ پرواز ہے شمع فروزِ پردۂ راز
ہمدم جو بکاؤلی نے پایا غمّاز یہ غم خوشی میں لایا
بھڑکائی[51] جمیلہ مادر اُسکی گزرانی خبر برابر اُسکی
اک شب کی تھی خالِ روئے شامت[52] یا مردمِ دیدۂ قیامت

جمیلہ آئی اور اُس نے تاج الملوک اور بکاؤلی کو ایک ساتھ پایا

وہ شعلۂ آتشیں لپک کے بجلی سی گری چمک دمک کے
دونوں کی رہی نہ جان تن میں کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں
شہزادہ پہ اُس نے مار چنگال دریائے طلسم میں دیا ڈال
بیٹی کی طرف کیا نظارہ جھلا کے کہا کہ خام[53] پارہ

---

۵۱ معرکۂ چکبست و شرر کے ساتھ جو نسخہ چھپا ہے اُسمیں بھی یہ شعر اسی طرح تحریر ہے لیکن (ف) لکھکر حاشیہ پر اس طرح تحریر ہے ؎ بھڑکا کے جمیلہ اُس کی مادر۔ پہونچائی خبر اُسے برابر

۵۲ محاورہ ہے یعنی نہایت خوف زدہ۔

۵۳ ایک طریقہ دشنام بمعنی بدمعاش و آوارہ عورت۔

حرمت میں لگایا داغ تو نے   لٹوائی بہارِ باغ تو نے

تھمتا نہیں غصہ تھامنے سے   چل دور ہو میرے سامنے سے

خجلت سے پری زمیں میں گڑ کے[۵۱]   سایہ سے رہی قدم پکڑ کے

مادر نے ہزار پاسباں میں   رکھا اُسے قید کے مکاں میں

پابزنجیر ہونا بکاؤلی کا سودائے فراقِ تاج الملوک میں

سودائے الم ہے اب جو تحریر   حرفوں سے قلم ہے پا بزنجیر

سنسان وہ دم بخود تھی رہتی   کچھ کہتی تو ضبط سے تھی کہتی

کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں   آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں

جامے سے جو زندگی کے تھی تنگ   کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ

یکچند جو گزرے بے خور و خواب   زایل ہوئی اُس کی طاقت و تاب

صورت میں خیال رہ گئی وہ[۵۲]   ہیئت میں مثال رہ گئی وہ

آنے لگے بیٹھے بیٹھے چکر   فانوس[۵۳] خیال بن گیا گھر

---

۵۱ زمین میں گڑنا انتہائی شرم و انفعال کے موقع پر بولتے ہیں

۵۲ یعنی صورت کے اعتبار سے وہ ایک خیالی صورت بن گئی تھی اور ہیئت (حلیہ) کے لحاظ سے وہ مثال ہو گئی تھی مثال علم ہیئت کی رعایت سے لائے ہیں۔ جس طرح علم ہیئت میں ایک چیز حقیقتاً موجود نہیں ہوتی بلکہ مثال کے طور پر اسکا ذکر کیا جاتا ہے وہ حالت بکاؤلی کی ہو گئی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ صد درجہ ضعیف و نقیہ ہو گئی تھی۔

۵۳ فانوس خیال یا فانوس خیالی کاغذ سے منڈھ کر ایک بڑی قندیل کی شکل بناتے ہیں جس کے اندر ہاتھی گھوڑے وغیرہ کا چکر بنا کے لگا دیتے ہیں اور وہ ہوا یا چراغ کے دھوئیں سے گردش کرتا ہے۔ سوار اور ہاتھی گھوڑے دوڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بچے اسے دیکھکر بہت خوش ہوتے ہیں۔ اسی کو شکار گاہ بھی کہتے ہیں۔

پریاں جو اُس کی پاسباں تھیں — دانا و عقیل و خوش بیاں تھیں
سمجھانے لگیں کہ مرتی ہے کیوں — ترکِ خور و خواب کرتی ہے کیوں
ثابت کچھ اثر ستارے کا ہے — کس[1] چاند کو کیا گہن لگا ہے
رحم اپنی جوانی پر ذرا کر — مُنہ دیکھ تو آئینہ منگا کر
صورت تری زار ہو گئی ہے — گُل ہو کے تو خار ہو گئی ہے
ہے ہے تری عقل کس نے کھوئی — ناجنس کو چاہتا ہے کوئی
سہتی نہیں آگ ماہیِ تر — رہتا نہیں پانی میں سمندر[2]
مذکور نہیں ہے کچھ حسد کا — ساتھی نہیں کوئی کارِ بد کا
روشن[3] ہے جو کچھ کیا ہے اندھیر — پھیر اپنی سمجھ۔ سمجھ کا ہے پھیر
محبوس کیا ہے تجکو ہرچند — توبہ کا تو در نہیں کیا بند
بھولے سے بھی کر نہ یاد آدم — پھر گھر وہی تو وہی وہی ہم
اے شمع نہ سوچ گر بد و نیک — رشتہ کاٹے گا تجھسے ہر ایک
سمجھانے سے تھا ہمیں سروکار — اب مان نہ مان تو ہے مختار
تو قید جفا میں ہے کہ ہم ہیں — تو دامِ بلا میں ہے کہ ہم ہیں
غم راہ نہیں کہ ساتھ دیجے — دُکھ بوجھ نہیں کہ بانٹ لیجے
جھنجلائی بکاؤلی کہ بس بس — اب ایک کہو گی تم تو میں دس

۱ے یعنی تو کیسی خوبصورت ہے اور کس مصیبت میں گرفتار ہے۔ ۲ے سمندر ایک کیڑے کا نام ہے جو مشہور ہے کہ آگ میں رہتا ہے۔
۳ے مطلب یہ ہے کہ جو کچھ تو نے غضب ڈھایا۔ ہے وہ سب کو معلوم ہے اب اپنا خیال پلٹ دے اس لئے کہ یہ تیری سمجھ کا پھیر (خام خیالی) ہے۔ روشن اور اندھیرے میں صنعت طباق ہے۔

رنجور جو ہوں تو میں تمھیں کیا — مجبور جو ہوں تو میں تمھیں کیا

مانا مری حالت اب ردی ہے — بہتر ہے وہی جو کچھ بدی ہے

بلبل اسی رشکِ گل کی ہوں میں — تم کیا ہو ہزار میں کہوں میں

سوچیں وہ کہ یہ نہیں سمجھتی — ہے بلکہ برنگ زلف اُلجھی

مجنوں ہو اگر تو فصد لیجئے — سایہ ہو تو دوڑ دھوپ کیجئے

کچھ روگ جو درپۓ خلش ہو — درماں کے لئے دوا دوش ہو

بیمارِ عشق لا دوا ہے — اس باغ کی اور ہی ہوا ہے

آخر یہ تو جی سے اپنے ہے تنگ — ایسا نہ ہو لائے اور کچھ رنگ

یاد آئیں جو ابروانِ خمدار — رستے نہ کہیں گلے پہ تلوار

وہ سبزۂ خط جو یاد آئے — جھنجھلا کے کہیں نہ زہر کھائے

کر یاد کہیں چہِ ذقن کو — کودے نہ کنوئیں میں باؤلی ہو

دیوانے کی مطلق العنانی — ہے باعثِ مرگ ناگہانی

تدبیر کا حوصلہ نکالا — زنجیر کا سلسلہ نکالا

بیڑی تھی زرخ جنوں کی کاکل — پابوسئ گل کو آیا سنبل

جب وحشتِ عشق ہو زیادہ — زنجیر ہو پیشِ پا فتادہ

---

۵۱ بدی ہے یعنی جو کچھ قسمت میں ہے۔ بدی کا لفظ بہتر کی رعایت سے لائے ہیں۔

۵۲ سایہ کے معنی آسیب کے ہیں، "دوڑ دھوپ" "سایہ" کی رعایت سے ہے۔

۵۳ باؤلی کے معنی دیوانی کے ہیں۔ چاہ اور کنوئیں کی رعایت سے باؤلی (ایک بڑا سیڑھیوں دار کنواں) کا لفظ لائے ہیں اسے صنعت تجنیس کہتے ہیں۔

۵۴ یہاں پیش پافتادہ سے یہ مطلب ہے کہ جب وحشتِ عشق زیادہ ہو تو زنجیر (اسکے لئے) ایک پرانی رسم ہے۔ اور یہ بھی مطلب ہے کہ زنجیر پاؤں کے سامنے پڑی ہوئی ہے یعنی پاؤں کے لئے زنجیر رکھی ہوئی ہے۔

شوریدہ بکاؤلی غضب تھی — زنجیروں میں بھی وہ بند کب تھی
بڑھتی جب دل کی بیقراری — پڑھتی یہ غزل بآہ و زاری

غزل

عالم کا ترے جہاں بیاں ہے — بیتابیٔ دل جہاں جہاں ہے
زنجیر جنوں کڑی نہ پڑیو — دیوانے کا پاؤں درمیاں ہے
ذرّے کا بھی چمکے گا ستارہ — قایم جو زمین و آسماں ہے
جو داغ کہ مہر ہے فلک پر — دل میں مرے اب تلک نہاں ہے
کس سوچ میں ہو نسیم بولو — آنکھیں تو ملاؤ دل کہاں ہے

آنا تاج الملوک کا صحرائے طلسم سے روح افزا پری کے ساتھ فردوس میں

بہرِ گہرِ طلسم اخلاص — ہے بحرِ سخن میں خامہ غواص
وہ قطرۂ بارشِ جدائی — وہ غرقۂ بحرِ آشنائی
وہ بادشہِ حباب افسر — یعنی تاج الملوک مضطر
بے مہریِ چرخ سے جو ناگاہ — گرداب کے ہالے کا ہوا ماہ
جو ماہ سپہر برتری تھا — سو ماہیِ بحرِ ابتری تھا

سلہ یعنی جہاں تیرے ادائے حُسن کا ذکر ہے وہاں بیتابیٔ دل بے حد و بے پایاں ہے۔

بادل سا وہ بحر آسماں جوش — بجلی[۵۱] سی لہر سے تھا ہم آغوش
دریا تھا نہ بحر تھا نہ جیحوں — طوفانِ طلسم جوشِ افسوں
گرتے تو وہ پانی سر سے گذرا — اُبھرا تو نہ کچھ نظر سے گذرا
موجوں کی عوض تھی چینِ داماں — گرداب کے بدلے تھا گریباں
آگے جو بڑھا جزیرہ دیکھا — اشجار کا واں ذخیرہ دیکھا
جس پھل کو چھوا جو پھر کیا غور — ہاتھ آیا نہ کچھ حباب کے طور
جانا کہ طلسم کا ہے جنگل — ہے یاں کے درخت کا یہی پھل
اور آگے بڑھا وہ بحرِ اوہام — ڈوبا خورشید ہوگئی شام
ڈر جانوروں کا جی میں پیٹھا — اک نخل کہن پر چڑھ کے بیٹھا
ناگاہ سُنی صدائے پُر خوف — آیا اک اژدھا پئے طوف
صورت میں پہاڑ کی نشانی — سیرت میں بلائے ناگہانی
مُنہ کھول کے سانپ اک نکالا — اُس کالے نے من زمیں پہ ڈالا
لہرا لہرا کے اوس چاٹی — بن میں کالوں نے رات کاٹی
جب صبح ہوئی تو مُنہ میں ڈالا — کالے نے من اژدھے نے کالا
وہ جا کے افق میں مہر چمکا — من افعیٔ شب کے مُنہ سے نکلا
سوچا وہ کہ لیجے من کسی طور — دشمن کا تھا سامنا کیا غور
کچھ گائیں کلیلیں کر رہی تھیں — بن میں ہری دوب چر رہی تھیں
دودھ اُن کا دوہا پیا کہا لو — گوبر[۵۲] کے انھیں کی چھوت پھینکو

---

[۵۱] معرکۂ چکبست و شرر کے ساتھ جو نسخہ چھپا ہے اسمیں حاشیہ پر یہ مصرع یوں لکھا ہے۔ تھا بجلی سی لہر سے ہم آغوش

[۵۲] مشہور ہے کہ من کے لئے اُسپر گوبر پھینک دیتے ہیں۔

نکلا جو پھر آکے شب کو اژدر
گلخن سے دھواں دھویں سے اخگر [۵۱]

گوبر پھینکا تو دب گیا من
بادل میں چھپا وہ ماہ روشن

بے روشنی اندھے ہو گئے وہ
من ڈھونڈتے آپ کھو گئے وہ

من لے کے جو اُس نے مہرہ مارا [۵۲]
شب کاٹ کے صبحدم سدھارا

دو مرغ تھے بیٹھے اک شجر پر
مادہ لگی پوچھنے کہ او نر

میں تجربہ کر چکی جہاں کا
کھلتا نہیں کچھ طلسم یاں کا

مادہ سے یہ سُن کے بول اُٹھا نر
ہے طرفہ طلسم اس جگہ پر

وہ پیڑ جو حوض پر لگا ہے
طوبیٰ [۵۳] سے خواص میں سوا ہے

اک سانپ ہے وہاں پہ چوٹ کرتا [۵۴]
مارے سے نہیں کسی کے مرتا

لیکن جو یہ بندۂ خدا جائے
تا حوض قدم قدم چلا جائے

لپکے گا خود اُس کو دیکھ کر سانپ
مُنہ چادرِ آب میں یہ لے ڈھانپ

اُبھرے گا لگا کے جب یہ غوطا
بن جائے گا آدمی سے طوطا

اندیشہ نہ اپنے دل میں لائے
اُڑ کر یہ اُسی شجر پہ جائے

---

۵۱ اژدر کو گلخن (انگیٹھی) اور اژدر کے مُنہ سے جو سانپ نکلا اُسے دھواں اور اُس سانپ سے جو من نکلا اُسے اخگر (چنگاری) سے استعارہ کیا ہے۔

۵۲ مہرہ مارا یعنی کامیابی حاصل کی۔ مہرہ من کی مناسبت سے لکھا ہے۔

۵۳ طوبیٰ ایک درخت کا نام ہے جو بہشت میں ہے۔

۵۴ چوٹ کرنا۔ حملہ کرنا۔ سانپ اور مارے میں رعایت لفظی ہے۔

سب خشک ہے ایک ہی ہری ڈال — دو رنگ کے پھل ہیں سبز اور لال

پہلے تو یہ لال پھل کو کھائے — انسان کا رنگ روپ پائے

پھر توڑ لے اُس کے سبز پھل کو — پھل کچھ اُسے دے رہیگا کل کو

جس شخص کے پاس وہ ثمر ہو — ہتھیار نہ اُس پہ کارگر ہو

لکڑی میں اثر یہ ہے کہ دشمن — بن جاتا ہے موم اگر ہو آہن

دو ہاتھوں میں لے جو کاندھے پر سے — اُڑتا پھرے جیسے مُرغ پَر سے

ٹوپی جو بنائے چھیل کر چھال — دکھلائی نہ دے نظر کی تمثال

پتّے کی صفت بیان کیا ہو — دم بھر میں بھرے جراحتوں کو

مُنہ میں رہے گوند اُسکا جب تک — لگتی نہیں بھوک پیاس تب تک

تھا طُلسم غیب مُرغ گویا — سُنتے ہی اُدھر چلا وہ جویا

کالے نے جہاں سے کی سیاہی[۱] — وہ حوض میں تھا مثال ماہی

طوطا بن کر شجر پہ آ کر — پھل کھا کے بشر کا روپ پا کر

پتّے پھل گوند چھال لکڑی — اُس پیڑ سے لیکے راہ پکڑی

ہاتھ آ جو گئی عصا کی تاثیر — پرّاں ہوا صورت عصافیر

اُڑتا ہوا وہاں سے دور جا کر — ٹھہرا دم لینے اک جگہ پر

۱؎ کالے نے جہاں سے کی سیاہی ۔ الخ "یعنی جہاں سے کالا سانپ نمایاں ہوا وہیں وہ حوض میں کود گیا۔

سیاہی کردن ۔ مرادف سیاہی زدن و بمعنی کنایہ از نمایاں شدن ۔ طاہر غنی سے

ماہِ نو نتواند از روئے خجالت شد سفید — چوں سیاہی میکند از گوشۂ ابروئے دوست

از بہار عجم

من ران کو چیر کر چھپایا   پتے سے وہ زخم سب بھر آیا

اک حوض پُر آب و تاب دیکھا   سر چشمۂ آفتاب دیکھا

غوطا جو لگا کے سر اُٹھایا   وہ حوض وہ آب کچھ نہ پایا

حوض میں غوطہ لگانے سے وہ مرد سے عورت ہو گیا اس پر وہ بہت پریشان ہوا

نامردی سے اپنی نعرہ زن ہو   بیچاری چلی کسی طرف کو

آگے سے جوان ایک خوش قد   آتا تھا دلوں کی جیسی آمد

اب دونوں کے ملنے کا ذکر ہے

بارے جو پڑی گھر اُس کے بے قید   امید[51] سے رہ گئی وہ نو مید

جب جن کے نہانے کا دن آیا   غوطہ کسی حوض میں لگایا

اُبھری تو نہ حوض تھا نہ وہ جُو   پانی کے عوض تھی دشت کی دھوپ

دو شعر حذف کر دیے گئے جنھیں ذکر ہی کہ وہ پھر مرد ہو گیا

گو شمع بنا چراغ دامن   روشن نہ ہوا وہ رنگ[52] روغن

تھا مردمِ دیدۂ طلسمات   خالِ رُخ و رنگ رو مساوات

ایک شعر نکال دیا گیا جس میں ایک بدصورت دیونی کا ذکر ہے

زنبور سیاہ خال اُس کے   برگد کی جٹائیں بال اُس کے

گٹھا لئے سر پہ لکڑیوں کا   چلتی تھی سموم کا سا جھونکا

شہزادہ کہ تھا کریہ منظر   وہ روسیہ اُسکو سمجھی شوہر

---

۵۱ امید سے رہ گئی یعنی حاملہ ہو گئی۔

۵۲ رنگ روغن بمعنی حسن و جمال۔

گٹھا وہ دیا کہ بیچ لا جا — کچھ نہیں دیر جلد آ جا
حیرت زدہ شاہزادہ ناچار — راہی ہوا سر پہ رکھ کے انبار
جب بڑھ کے ہوا نظر سے اوجھل — ہلکا ہوا پھینک پھانک بوجھل
واں سے جو بڑھا تو ایک چشمہ — پُرآب تھا چشم منتظر سا
غوطہ جو لگا کے سر اُبھارا — پایا وہی رنگ روپ سارا
کھویا ہوا مال ہاتھ آیا — بولا وہ کہ شکر ہے خدا یا
خورشید مرا گہن سے چھوٹا[1] — زنگ آئینہ بدن سے چھوٹا
یارب یہی اب میں چاہتا ہوں — یہ چشمہ پھر آنکھ سے نہ دیکھوں
ناداں ہو جو آبرو کو کھوئے — اُس پانی سے مُنہ اور ہاتھ دھوئے
یہ کہکر کاندھے رکھ کے لاٹھی — گھوڑوں پہ ہوا کے باندھی کاٹھی[2]
کھانے کو شجر کا گوند تھا پاس — کیا دخل کہ بھوک لگتی یا پیاس
دیکھا ناگاہ کوہ البرز — اک دیو سیاہ تھامے گرز
ٹوپی وہ جو سر پہ چھال کی تھی — عریانی میں پردہ حال کی تھی
اُس دیو کے آگے سے بڑھا وہ — سایا سا پہاڑ پر چڑھا وہ
گریاں لبِ حوض اک پری تھی — فوارے کی طرح رو رہی تھی
پُرجوش و خروش اُسے جو پایا — روپوش نے تاجِ سر اُٹھایا
دیکھا جو پری نے آدمی زاد — آہستہ کہا کہ خانہ برباد

---

[1] یعنی بدصورتی زائل ہوگئی اور پھر بدستور خوبصورت ہوگیا۔

[2] یعنی ہوا پر اُڑا۔

رستا ترا کھو گیا کہاں سے | کھا جائیگا دیو بھاگ یہاں سے

بولا وہ بشر کہ دیو کیسا | ہم کو تو ملا نہ کوئی ایسا

بولی وہ پری کہ جا کہا مان | سر پر ہیں ترے قضا کے سامان

بولا وہ کہ بے قراری کیا ہے | تم اپنی کہو ہماری کیا ہے

کیوں روتی ہو کس کی یاد میں ہو | کیا رنج ہے کس فساد میں ہو

بولی وہ حسیں کہ میں پری ہوں | اس دیو کے بس میں آگئی ہوں

فردوس کا بادشاہ مظفر | روح افزا جس کی ہوں میں دختر

سردار کرڑور دیوں کا ہے | سلطانِ ارم مرا چچا ہے

اک[1] دن میں چلی چچا کے گھر کو | ماندی تھی بکاؤلی خبر کو

رستے سے یہ دیو پھانس لایا | ابتک تو خدا نے ہے بچایا

نام اُس سے بکاؤلی کا سُنکر | رونے جو لگا وہ سر کو دُھن کر

پوچھا اُس نے کہ آدمی زاد | تو کیوں رویا کہا کہ فریاد

واں خرمنِ عیش پر پڑی برق | یہاں بحر فسوں میں میں ہوا غرق

وہاں پھانس چبھی ہے اُسکو غم کی | یہاں سانس نہیں ہے ایک دم کی

بولی وہ کہ چھوٹتے اگر ہم | رکھتے ترے زخم دل پہ مرہم

بولا وہ کہ چل کہا کہ ناداں | وہ دیو کہاں کہاں تو انساں

دیوؤں سے بھی لڑسکا ہے کوئی | سایے کو پکڑ سکا ہے کوئی

بولا وہ کہ جی[2] بجھا نہ جانی | دیو آگ تو آدمی ہے پانی

ف۱ مطلب یہ کہ بکاؤلی علیل تھی میں چچا کے گھر کو (اُسکی) خبر کو چلی۔

ف۲ یعنی افسردہ نہو۔

ہر چند کہ انس و جاں میں ہے لاگ — دب جاتی ہے مشتِ خاک سے آگ
بولی وہ کہ سُن تو آدمی زاد — وہ دیو ہے تیری کیا ہے بنیاد
تجھ پاس تو اک عصا ہے جانی — لاٹھی سے جدا نہ ہوگا پانی
بولا وہ کہ یہ جو لٹھ مرا ہے — موسیٰ کا عصا[۱] ہے اژدہا ہے
یہ کہکے جتائے جوہر اپنے — سامان دکھائے یکسر اپنے
ٹوپی جو اُتار لی تھی سر سے — پھر رکھ کے نہاں ہوا نظر سے
لٹھ کاندھے پہ رکھ ہوا پہ جا کر — ظاہر ہوا ٹوپی کو اُٹھا کر
یہ شعبدہ دیکھکر پری نے — اُڑ چلنے کے پائے کچھ قرینے
تسکیں جو ہوئی پری کے جی کو — وہ آدمی لے اُڑا پری کو
وہ دیو پری کو اُڑتے پاکر — اُچکا تو ملا ہوا پہ جا کر
شہزادے نے اپنی سر کی ٹوپی — جلدی سے پری کے سر پہ رکھدی
بدلی میں چھپی وہ ماہ روشن — بجلی سا عیاں ہوا یہ پُرفن
وہ دیو کہ تھا پری پہ لپکا — حیرت زدہ آدمی پہ لپکا
شہزادہ کہ لٹھ سے برق[۲] دم تھا — بادل سا ہوا کا ہمقدم تھا

---

[۱] حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا میں یہ خواص تھا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اسے زمین پر پھینکدیتے تھے تو وہ اژدھا بن جاتا تھا۔ فرعون کے ساحروں نے جب آپکے مقابلہ میں آکر سحر سے سانپ بنا کر آپ پر چھوڑے تھے تو یہ عصا اژدھا بن کر اُن سب سانپوں کو نگل گیا تھا۔ یہی عصا آپنے دریائے نیل پر مارا تھا جس سے بارہ راستے پیدا ہوگئے تھے۔

[۲] تیز و چالاک

دیکھا جو نہ دیو نے گذارا   پتھر اک اُٹھا کے پھینک مارا
وہ سنگِ گران حربۂ غول   تاثیر سے پھل کے بنگیا پھول
لٹھ اُس کا پڑا تو وہ ہوا چور   جس طرح عصا سے جامِ بلور
غل کرکے زمیں پر گرا دیو   موجود ہوئے ہزارہا دیو
بادل کی طرح جو اُمڈے دشمن   لاٹھی سے ہوا وہ برقِ خرمن
موسیٰ کا عصا تھا لٹھ جواں کا   ایک ہی لاٹھی سے سب کو ہانکا
سرمہ کیا کوہ پیکروں کا   جی چھوٹ گیا دلاوروں کا
ٹوپی کو اُتار کر پری نے   چومے قدم بشر پری نے
شہزادے نے تاج سر پہ رکھا   لٹھ کاندھے پہ دل سفر پہ رکھا
فردوس میں جا کے صورتِ حور   ماں باپ سے آ ملی وہ مہجور
دیووں کی وہ سرکشی سُنائی   انساں کی وہ مردمی جتائی
سُن سُن کے اُڑے حواس اُنکے   لائے نہ یقیں قیاس اُنکے
پوچھا کہ وہ ہے کہا کہ ہاں ہے   پوچھا کہ کہاں کہا یہاں ہے
یہ سُنتے ہی اُسنے تاج اُٹھایا   حیرانوں کو شعبدہ دکھایا
بال اُسکے وبال سے بڑھے تھے   ناخن بھی ہلال سے بڑھے تھے
تن خاکی تھا جاں آتشیں تھی   عُریانی قبائے پوستیں تھی
صورت سے فقیر تھا بروگی   کی آؤ بھگت سمجھ کے جوگی
حسن آرا اُس پری کی مادر   باپ اُس کا پادشہ مظفر
قدموں پہ گرے کہا ادب سے   حرمت رہی آپ کے سبب سے

بولا وہ خدا خدا کرو واہ — ہے جملہ جہاں کا مالک اللہ
قادر وہی کبریا وہی ہے — آخر وہی ابتدا وہی ہے
بولی وہ کہ حق ہے جو ہے فرمان — تم وقت کے اپنے ہو سلیمان
کھولو کمر آؤ لطف فرماؤ — شربت پیو میوہ ہائے تر کھاؤ
بولا وہ کہ اشتہا کسے ہے — کھانے کا مزا رہا کسے ہے
سیاح کو کیا قیام سے کار — شبنم نہیں جاگزین گلزار
درویش رواں رہے تو بہتر — آب دریا بہے تو بہتر
روح افزا بول اُٹھی اجی واہ — ہم جانے نہ دینگے تم کو واللہ
آرام کرو کرم کرو آؤ — ہم رام ہوئے نہ رم کرو آؤ
مجمع سے الگ مکاں میں لائی — آرام کی جا قرار پائی
اصحاب نیاز کھانے لائے — ارباب نشاط گانے آئے
تھا اپنے ہی سوچ میں وہ سنسان — دُھن راگ کی تھی نہ رنگ کا دھیان
بیوقت وہ راگ خوش نہ آیا — بے فصل وہ پھاگ خوش نہ آیا

آنا بکاؤلی کا روح افزا کی خبر کو جمیلہ کے ساتھ اور تاج الملوک سے مل کر جانا سات دن بعد

بچھڑوں کے جو ملنے کا بیاں ہے — یوں خامہ خوشی سے تر زباں ہے
روح افزا کو جو کھو کے پایا — مژدہ شاہِ ارم تک آیا

جانا تھا یگانگی میں لازم — چلنے کو ہوئی جمیلہ عازم

وہ ساکنِ خانۂ سلاسل — یعنی وہ بکاؤلی بیدل

کہتی تھی کہ بیچ سے نکلتی — خواہش ہوئی کہ میں بھی چلتی

سُن کے قیدی کے زار نالی[1] — زنجیر کے پیچ سے نکالی

تخت اُن کی سواریوں کے آئے — اڑتے وہ ہوا کے جھونکے آئے

بانوئ شہِ ارم جمیلہ — دخت اُسکی بکاؤلی عقیلہ

روح افزا سے ہوئیں بغل گیر — صورت پوچھی کہا کہ تقدیر

کہہ سُن کے مبارک وسلامت — بیٹھ اُٹھ کے ہوئی جمیلہ رخصت

روح افزا نے کہا چچی جان — تم جاؤ رہیں بکاؤلی جان

خاطر سے کہا کہ خیر لیکن — لیجاؤنگی خود میں ساتویں دن

یہ کہکے وہ وحشتِ مجسم — آہو سی ارم کو کرگئی رم

روح افزا نے کہا بہن سے — بہتر کوئی جا نہیں چمن سے

گلگشت کریں چلو کہا خیر — کیا جانے کہ ہوگی سیر میں سیر

چل پھر کے ہنسی ہنسی میں پوچھا — کھونا ملنا بہن یہ کیا تھا

روح افزا نے کہا کہ ہمشیر — میں نے یہ سنا کہ تو ہے دلگیر

واللہ کہ چھان کر خدائی — تیرے پیارے کو ڈھونڈھ لائی

سمجھی وہ ہنسی کہا سڑن ہو — ناداں ہو کیا کہوں بہن ہو

ہمکو یہ ہنسی نہیں گوارا — پیارا ہوئیگا وہ تمہارا

پیارا جو نہ تھا تو کھو گئیں کیوں — بدراہ بھی آپ ہوگئیں کیوں

---

[1] اکثر نسخوں میں "زار نالی" اور "نکالی" یائے مجہول ہے مگر بہتر یہ یائے معروف معلوم ہوتا ہے۔

بولی وہ آشنا تمہارا — پیارا نہیں پیارے کا ہے پیارا
گر اسکی تلاش میں ہیں کھوئی — بدراہ نہ کہہ سکے گا کوئی
جو چاہو کہو جواب کیا دوں — قائل نہیں ہوتی ہو دکھادوں
وہ جوگی وہ دھونی اور وہ آسن — دکھلایا تو تھی اُسی کی جوگن
دیکھا تو دکھا رہی ہے تقدیر — کوشش کا اثر کشش کی تاثیر
روح افزا اُنکے بیچ میں واں — قالب تھی میان جان وجاناں
دونوں کا بدل تھا وصل منظور — مانند حجاب ہوگئی دور
وہ غرقۂ بحر ظلم و بیداد — دریا[۵۱] رویا سنا کے افتاد
خاطر کی کدورتیں عیاں کیں — چشموں کی صورتیں بیاں کیں
رو رو کے بکاؤلی دل افگار — بولی کہ خدا کو علم ہے یار
پھرتا تھا تو چشم و دل میں میرے — دیدے مرے نقش پا تھے تیرے
مشکل مجھے اپنا تھامنا تھا — ہر وقت قضا کا سامنا تھا
ہمچشم پھرے تھے مثل مژگاں — ہمسایہ تھے کشیدہ[۵۲] داماں
گھر میں رہنا گراں تھا میرا — زنجیر کا گھر مکاں تھا میرا
جو کہکے سخن پکارتا تھا — پتھر سا کھینچ مارتا تھا
سختی سہی یا کڑی اٹھائی — افتاد تھی جو پڑی اٹھائی

---

۵۱ "غرقۂ بحر" کی مناسبت سے "دریا رویا" کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ غرقۂ بحر ظلم و بیداد (یعنی تاج الملوک) اپنے مصائب سنا کر رویا۔

۵۲ دامن بچائے ہوئے۔ یعنی کوئی ملنا پسند نہیں کرتا تھا۔ بیاض گلزارِ نسیم کے نسخے میں یہ مصرع اس طرح ہے
ہمسایہ تھے سب کشیدہ داماں۔

طالع سے کسے تھی ایسی امید — نکلا ہے کدھر سے آج خورشید

کیوں نہ پہ شفق خوشی سے پھولی — کیا شام وصال راہ بھولی

یہ کہکے ملے ہم وہ ایسے — صفحے خطِ توأماں[۵۱] کے جیسے

اک جان دو تن تھے سرو بالا — صحبت کا مزا ہوا دوبالا

درباں سی تھی در پہ روح افزا — تھا پیشِ نظر حیا کا پردا

ایک شعر نکال دیا گیا ہے جسمیں روح افزا کے اندر آنے کا ذکر ہے

بول اُٹھی بکاؤلی کہ واری — محرم کا ہے کام پردہ داری

وہ بولی مجھے تو کچھ نہ آیا — تمنے مگر آب تو ہے سکھایا

کیا جانیں ابھی بدا ہے کیا کیا — اس عمر میں سیکھنا ہے کیا کیا

بارے وہ مہ دو ہفتہ باہم — یک ہفتہ رہی انیس وہمدم

سمجھی ہفتے کی میہمانی — ہر ہفت عروس شادمانی

وعدے پہ جمیلہ ساتویں دن — آئی تو تھا حیلہ غیر ممکن

ساتھ اُسکے رواں ہوئی وہ گلرو — ہوش[۵۲] اسکے ہوا ہوئے کہے تو

چاہا کہ وہ تاج رکھ کے سر پر — رہے روپوش ساتھ چل کر

دامن کو پکڑ کے روح افزا — بولی کہ کدھر کیا ارادا

الفت کے بہت نہ جوش میں آؤ — کچھ خیر ہے تم کو ہوش میں آؤ

نافہمی سے خوار ہو چکے ہو — ابتو سیکھو کہ کھو چکے ہو

---

۵۱ خطِ توأماں۔ جو دو ورقوں پر لکھا جاتا ہے اور وہ دونوں ورق جب ملائے جاتے ہیں تو پڑھا جاتا ہے۔

۵۲ یہ فارسی انداز بیان ہے۔ تو گوئی ہوشش پران شد کا ترجمہ ہے۔

کارِ مشّاطہ خود نہ کیجئے | انگارے کو ہاتھ سے نہ لیجئے
جلدی نہیں کیا ضرور دم لو | بیدل نہ ہو قول لو قسم لو
گھبراؤ نہ پاکے نا مرادی | غم کھاؤ جو چاہتے ہو شادی
سوچا تو نہ تھا صلاح اُلجھنا | دانائی تھی بات کا سمجھنا

پیغام لیجانا حُسن آرا کا بکاؤلی کی شادی کے واسطے

بیدل نے جگہ جو جی میں پائی | یوں خامے نے کی زباں کشائی
وہ شکر گذار روح افزا | ماں سے بولی کہ حُسن آرا
واجب ہے ادائے حقِّ مہماں | احساں[1] کا عوض نہیں جُز احساں
حسن آرا نے کہا کہ بہتر | جو اپنے سے ہو نہیں میں باہر
بولی وہ کہ یہ فقیر جوگی | ہے عشق بکاؤلی کا روگی
میں اسکے سبب بچی ہوں جی سے | یہ میرے سبب ملے پری سے
راز اُنکا کیا جو آشکارا | راضی ہوئی سُن کے حسن آرا
بلوا کے مصور اک کہن سال | کھنچوائی اُس آدمی کی تمثال
وہ صورتِ حال ارم میں لائی | خلوت میں جمیلہ پاس آئی
چھیڑا کہ ہو مہ سے عقد پرویں | پیوند نہال گُل ہو نسریں
واجب نہیں اب تامل اسمیں | بھرئیے[2] وہیں تک نہ چھلکے جسمیں

---

[1] ترجمہ ہے آیہ کریمہ هَل جزاءُ الاحسان الّا الاحسان کا

[2] ایک لطیف پیرایہ بیان ہے مطلب یہ ہے بکاؤلی اب جوان ہوگئی ہے۔ زیادہ توقف اب ناقابل برداشت ہوگا۔

بولی وہ جمیلہ کیا بتاؤں — تو اپنی ہے تجھ سے کیا چھپاؤں
سودا ہے مری بکاؤلی کو — ہے چاہ بشر کی باولی کو
مشہور ہے ضد انس و جانی — یکجا نہیں رکھتے آگ پانی
حسن آرا نے کہا جمیلہ — مجکو یہ نہیں پسند حیلہ
کاوش تری بے ثبات ہے یہ — سو بات کی ایک بات ہے یہ
دو دل جو ہوں چاہنے پہ راضی — یہ جان سے کیا کرے گا قاضی
بولی وہ جمیلہ ہوش میں آؤ — جا کر کسی اور کو یہ سمجھاؤ
تجویز کی آپ کے میں قرباں — لیجائے مری پری کو انساں
حسن آرا نے کہا کہ خاموش — شعلہ کو کیا ہے کس نے خس پوش
اسباب نہ جمع کر ضرر کے — رکھ پنبہ نہ داغ پر شرر کے
بولی وہ جمیلہ پھر کروں کیا — وہ بولی نہ سمجھی کہتی ہوں کیا
جب دل ہی پری کا آگیا ہے — انساں ہے تو کیا مضائقہ ہے
انسان ہی تھے حضرتِ سلیماں[۵۱] — انسان ہی تھے مسیحِ دوراں
یہ قطرۂ[۵۲] بحرِ کبریائی — دریا ہے جو ہوئے آشنائی
کیا[۵۳] شکوہ اگر پری نہ سمجھے — افسوس جو آدمی نہ سمجھے
دم دھاگے میں رشتۂ نفس کے — پھندے میں پھنسا ہی پیش و پس کے

---

۵۱ حضرت سلیمان علیہ السلام نام ہے ایک پیغمبر کا جن کے قبضہ میں دیو پری اور جن تھے۔

۵۲ بحر کبریائی کا یہ قطرہ (انسان) اگر عرفان حاصل ہو (تو معلوم ہو کہ) ایک دریا ہے۔

۵۳ یہ اور اُسکے بعد کا دوسرا شعر اس قصہ کے سلسلہ میں نہیں ہے۔ بلکہ نسیم کا ایک عام درس عبرت ہے۔

بیاہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک کے ساتھ اور رہنا ارم میں

شادی کے لئے ہے کلک شنجرف — انگشت قبولِ دیدۂ حرف

حسن آرا تھی جو نیک تدبیر — دکھلائی جمیلہ کو وہ تصویر

پہچان کے خال و خط سے انداز — وہ چُپ جو رہی تو یہ سخن ساز

بولی کہو کیوں کہا کہ مانا — پر کھوئے ہوے کا کیا ٹھکانا

وہ بولی کہ اس سے تجکو کیا ہے — ہم نے تو سمجھ کے کچھ کیا ہے

ٹھہری یہ غرض کہ آج کی رات — فیروز شہ آگے چھیڑیئے بات

جب سونے کو وہ محل میں آیا — افسانۂ عشق اُسے سنایا

یاد اُس نے کیا بکاؤلی کو — لے آئے اُڑا کے اُس پری کو

تصویر لِشہ دکھائی اُس نے — شادی کی خبر سُنائی اُس نے

دیکھا تو نہ فرق تھا سرِ مو — جا نچے خط و خال و چشم و ابرو

نقشے سے وہی نگار پایا — قسمت کا لکھا سا آگے آیا

کہنے لگی دل میں یا الٰہی — شر ہو نہ کہیں یہ خیر خواہی

پیارے سے نہ ہو خلاف وعدا — کیا سوچتی ہوں نصیب اعدا

دیکھا تو وہ بھیدی حسن آرا — کرتی تھی اُسی کے رُخ نظارا

روح افزا کا جو آگیا دھیان — تسکین ہوئی آئی جان میں جان

جانا کہ بہار[1] فصل سے ہے — یہ نقل مطابق اصل سے ہے

---

[1] ترجمہ ہے اس فارسی مصرعہ کا ع سالے کہ نکوست از بہارش پیدا۔ یعنی اس تصویر اور ان حالات سے یہ آثار پائے جاتے ہیں کہ تاج الملوک ہی سے شادی ہوگی۔

اقرار میں تھی جو بے حیائی　　شرمائی لجائی مسکرائی
حسن آرا نے کہا مبارک　　ایجاب اُس نے کیا مبارک
سج دھج یہ بنی اِدھر بنائے　　بن ٹھن کے بنا اُدھر سے آئے
سیارہ شناس کو بلایا　　ساعت ٹھہرائی دن دکھایا
شادی کی خبر سے خوش خوش آئی　　مشتاق کو خوش خبر سنائی
راتوں کو جو گنتی تھی ستارے　　دن گننے لگی خوشی کے مارے
واں مہدی نے چومے پائے خورشید　　یاں سبز ہوا نہالِ اُمید
وہ واں پہ گلاب سے نہائی　　یاں تازگی آبرو نے پائی
واں غازہ[۵۱] سے رُخ شفق میں خورشید　　یاں جم گیا مُنہ پہ رنگِ امید
افشاں ہوئے واں ستارہ افشاں　　یاں جیغہ[۵۲] سے روشنی دوچنداں
واں مانگ سے رنگِ کہکشاں ماند　　یاں شعلۂ سر سے ہالے میں چاند
واں زلف نے کھائے پیچ پر پیچ　　طُرّہ کلغی پہ یاں تھا سر پیچ
آنچل ہوئے واں نقابِ عارض　　سہرا ہوا یاں حجابِ عارض
زیبا ہوا واں بدن پہ گہنا　　یاں جامہ وفا کا اُس نے پہنا
واں گل سے بہارِ بوستاں ہے　　آرایشِ تختِ[۵۳] گُل یہاں ہے
الماس کے واں تھے جھاڑ فانوس　　یہاں جلوہ فروشں تختِ طاؤس

---

۵۱ غازہ بمعنی اُبٹن تشبیہہ ہے یعنی غازہ سے رُخ کی یہ رنگت تھی جیسے شفق میں خورشید۔

۵۲ جیغہ۔ کلغی۔

۵۳ تختِ گُل۔ شادی میں جو پھلواری بناتے ہیں اُس رسم کی طرف اشارہ ہے۔

مہتاب سے چاندنی کا واں فرش   یاںؔ چرخی سے چرخ میں سرِ عرش
و اں جلوے حنائی انگلیوں کے   یاں روشنی کے تھے پنجشاخے

بادل سے وہ وہاں گرج رہے تھے   یہاں دھوم سے باجے بج رہے تھے
واں پریوں میں ذکر آدمی زاد   نوشہ کی جلو میں یاں پریزاد
گلگوں تھا کسی کا بادِ رفتار   گُلرنگ کسی کا تھا ہوا دار
ہاتھی تھے تو مستیوں کی دہشت تھی   گھوڑے تھے تو چابکی کی لت تھی
وہ ماہ کہ تھا سوار شبدیز   تھا پا بر کابِ شوق مہمیز
در تک جو برات اُدھر سے آئی   کی سب نے ادھر سے پیشوائی
فیروز مظفر ایسے دو شاہ   پر نور تھے جیسے مہر اور ماہ
باراںِ گلاب و بارشِ گُل   ہو کر بڑھے آگے با تجمل
سلطاں فیروز رشکِ جم تھا   نوشہ مسند پہ جم کے بیٹھا
ہریالے بنے کا شور و غل تھا   سنبل کا چنور تو چتر گُل تھا
گل سے خانوں میں زردہ لایا   اُن غنچہ دہانوں کو کھلایا
خورشید سا آفتابہ لائے   مُنہ ہاتھ ہر ایک کے دُھلائے
قلیاں پئے مشکبو دھواں دار   بیڑے چکھے پان کے مزے دار
جب عقد کی اُن کے ساعت آئی   دو رشتوں میں اک گرہ لگائی
یک جا کئے وہ عروس و داماد   وہ جان پری یہ آدمی زاد

---

[1] چرخی (آتشبازی) سے عرش کے سر میں چکّر تھا۔ مہتاب ۔ چاند اور چرخی ۔ چرخ اور عرش میں مناسبت لفظی ہے۔

حیرت نے آئینہ[۵۱] دکھایا — شربت دیدار نے پلایا

زلفیں ہوئیں چہرے کی بلاچیں — ٹونا وہ نگاہ سحر آگیں

جو چہرۂ آتشیں پہ تل تھا — اسپند نگاہ بد بدل تھا

جوڑی جو ملی بنے بنی کی — سنگت ہوئی راگ راگنی کی

جو گائنیں تھیں شہانے[۵۲] گائیں — لیتے ہوئے نیگ[۵۳] راگ لائیں

حق پاکے جو رکھتی تھیں قدامت — بول اُٹھیں مبارک و سلامت

پیارا تھا بنے بنی کا جوڑا — خلوت میں دولھا دُلھن کو چھوڑا

پریاں کہ ہزار ہا بھری تھیں — ارمان سی سب وہاں سے نکلیں

بے پردگی ہوتی تھی جو اُن میں — دروازوں نے بند کرلیں آنکھیں

دونوں کے خلوت میں ملنے کا ذکر ہے

جب اوڑھی عروس مہ نے چادر — نکلا پردے سے شاہِ خاور

ثابت وہ جو شب کو تھے ستارے — خورشید نکلتے ہی سدھارے

یعنی دولھا دلھن سحر گاہ — نکلے آرام گہ سے دلخواہ

---

۵۱ شادی بیاہ کے موقع پر اب بھی بعض گھرانوں میں بہت سی رسمیں رائج ہیں انھیں میں آرسی مصحف بھی ہے جسمیں دولھا کو دلھن کا چہرہ آئینہ میں دکھایا جاتا ہے۔ شربت پلانے کی بھی ایک رسم ہے۔ اسی طرح ٹونا گانے کی رسم ہے۔ یہ کچھ خاص فقرے ہوتے ہیں جو دولھا دولھن کے درمیان اخلاص و محبت قائم کرنے کی غرض سے گائے جاتے ہیں۔ آگے کے اشعار میں یہ تمام اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔

۵۲ عروسی کپڑے اور شادی کے گیت کو بھی کہتے ہیں۔

۵۳ نیگ۔ شادی کے وقت کا انعام۔

مُنہ گھر کو براتیوں نے موڑا
محظوظ دولہا دولھن کو چھوڑا
وہ حوضِ گلاب میں نہایا
یاں رُخ پہ عرق گلاب پایا
واں جوڑا چست تنگ بدلا
یاں جوڑے کے مُنہ کا رنگ بدلا
وہ[۲] راگ کا دیکھنے لگا رنگ
یاں پردے میں چھیڑ تھی خوش آہنگ

رخصت ہونا تاج الملوک کا بکاؤلی کو لیکر اور آنا گلشن نگاریں میں

غربت سے جواب[۱] سرِ وطن ہے
کلکِ دوزباں یہ حرف زن ہے
شادی ہو کر وہ خانہ آباد
سوچا کہ بنا میں خانہ[۳] داماد
غربت میں وطن کی دُھن سمائی
اُس فیل کو یاد ہند آئی
خلوت میں ہوا پری سے گویا
دُنیا میں ہیں سب وطن کے جویا
پانی تہِ خاک کو رواں ہے
لَو شعلے کی سوئے آسماں ہے
عزمِ سفرِ وطن سمجھ کر
بولی وہ بکاؤلی کہ بہتر
چلنے گا تو ساتھ ہیں بلا عُذر
رہنے گا تو بندگی میں کیا عُذر

---

[۱] مراد بکاؤلی سے ہے جواب تاج الملوک کی بیوی تھی۔

[۲] وہ یعنی تاج الملوک راگ رنگ دیکھنے میں معروف تھا اور یہاں (یعنی بکاؤلی کے یہاں) مزے مزے کی چھیڑیں ہو رہی تھیں۔ راگ۔ رنگ۔ چھیڑ پردے۔ خوش آہنگ میں صفت مراعات النظیر ہے۔

[۳] خانہ داماد اُس شخص کو کہتے ہیں جو سسرال میں بود و باش اختیار کرے۔

ہاتھ اُس کا پکڑ کے باہر آئی
ماں باپ کے پاس دختر آئی

ہوتے ہی دو چار خویش و دختر
دو سے ہوئے چار اُس جگہ پر

وہ تینوں تھے قوم کے پریزاد
چوتھا ان میں یہ آدمی زاد

چومی اس نے زمینِ خدمت
غربت سے وطن کی چاہی رخصت

فیروزشہ و جمیلہ بانو
دونوں ہوئے سُنکے سر بزانو

غوطے میں جو آگئے وہ یکسر
بولی ماں باپ سے وہ دختر

پردیسیوں سے جو کی ہے نسبت
اب کیجے ہنسی خوشی سے رخصت

دعویٰ نہیں کچھ دے ہوے پر
قائم رہیے کئے ہوئے پر

لازم جو ہوا اسمیں کد نہ کیجے
سائل کا سوال رد نہ کیجے

بولی وہ کہ بخت تھا زبردست
[۱]خورشید کو ذرے نے کیا پست

انساں سے جُھکی پری کی گردن
کانٹے سے رکا ہُوا کا دامن

یہ کہکے منگائے دو ہُوا دار
سو دیو بلائے باد رفتار

ہوکر دیوؤں کی زینت دوش
رخصت وہ اُدھر ہوئے اِدھر ہوش

اشکوں سے شگون لیا نرالا
آئینۂ[۲] رُخ پہ پانی ڈالا

سونپا مختار کو جو مجبور
گھر پاس تھا اور وہ منزلوں دور

---

۱ پری کو خورشید سے اور انسان کو ذرّے سے شباہت دی ہے۔ اسی طرح اگلے شعر میں انسان کو کانٹا اور پری کو ہُوا کہا ہے۔

۲ جب کسی کو رخصت کیا کرتے تھے تو آئینہ پر پانی ڈالتے تھے اور اُسے فال نیک سمجھتے تھے۔ یہاں آئینہ رخ پر اشکوں کے آنے سے فال نیک سمجھی گئی۔

آئے تو وہ باغ سحر بنیاد ۲۳ تھا آب و ہوائے خوش سے آباد

خیل و خدم اسکے منتظر تھے مانند حواس منتشر تھے

پہچان کے سب نے غل مچایا آیا تاج الملوک آیا

داخل جو ہوئے محل کے اندر محمودا لپکی دوڑی دلبر

پوچھا خوش خوش کہا کہ دم لو دیکھو یہ کون ہیں قدم لو

دلبر یہ وہی بکاؤلی ہے محمودا دیکھ کیا پری ہے

سبحان اللہ کہکے دلبر بولی کہ یہ گھر ہوا منور

محمودا نے کہا مبارک خوشنودی آشنا مبارک

اُن مختصروں نے جب دیا طول بولی وہ بکاؤلی کہ معقول

یہ سمجھو تو کچھ نہیں ہے تکرار خوش پوش ہے ایک جوڑے دو چار

درجے درجے رہیں وہ ذی ہوش ہمخانہ و ہمدم و ہم آغوش

طلب ہونا بکاؤلی کا راجا اندر کی محفل میں اور آگاہ ہو کر ہمراہ جانا تاجُ الملوک کا

تقدیر سے ہیں جو شادی و رنج اب یوں نے خامہ ہے نوا سنج

از بسکہ یہ چرخ فتنہ انگیز ہے خرمنِ عیش پر شرر ریز

یکچند وہ مہ تھی کاہشوں میں گذری اک عمر خواہشوں میں

تقدیر سے جب مراد پائی راجا اندر کو یاد آئی

اندراسن امرنگر ہے شہر ایک   خلقت ہے وہاں کی زندہ دل نیک
اندر ہے پادشاہ اُس کا   آسن ہے تخت گاہ اُس کا
مضمون وہ قضا سے اسقدر ہے   اُس بستی کا نام امرنگر ہے
یزدانیوں کا ہے مسکن اُسمیں   روحانیوں کا نشیمن اُسمیں
کہتے ہیں مورخانِ ہندی   آباد ہوا پہ ہے وہ بستی
راجا کہ کمال پارسا ہے   مقبول جناب کبریا ہے
خالق نے دیا ہے فوق اُسکو   نغمے سے ہے ذوق شوق اُسکو
انساں کا سرود و رقص کیا ہے   پریوں کا ناچ دیکھتا ہے
باری باری سے جو پری ہے   راجا اندر کی مجرئی ہے
لیکن جو بکاؤلی دل افگار   باری پہ پہنچ سکی نہ بیمار
اک شب راجا تھا محفل آرا   یاد آئی بکاؤلی دل آرا
پوچھا پریوں سے کچھ خبر ہے   شہزادی بکاؤلی کدھر ہے
مُنہ پھیر کے ایک مُسکرائی   آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی
چتون کو ملا کے رہ گئی ایک   ہونٹوں کو ہلا کے رہ گئی ایک
بولا وہ کہ چُپ ہو کیوں سبب کیا   بولیں وہ کہ کہئے بے ادب کیا
ناتا پریوں سے اُس نے توڑا   رشتہ اک آدمی سے جوڑا
وہ سُن کے خفا ہوا کہا جاؤ   جس طرح سے بیٹھی ہو اُٹھا لاؤ
پریاں اُڑیں اوپر اوپر آئیں   مہتابی پہ مثل ابر چھائیں

دیکھا تو وہ دونوں کرتے تھے خواب[۵۱]	گل تکیے تھے آفتاب و مہتاب
ہم بسترِ آدمی پری تھی	سائے کی بغل میں چاندنی تھی
غافل جو موکلوں نے پایا	اُس نقشِ مُراد کو جگایا
جاگی تو سب اُسکے جوڑ کی تھیں	اندر کے اکھاڑے کی پری تھیں
بولیں کہ طلب کیا ہے چلیئے	جوڑا یہ خراب ہے بدلئے
اُٹھی اُسے جی کی طرح چھوڑا	بدلا مانند رنگ جوڑا
ساتھ اُنکے وہ تا بمحفل آئی	لرزاں لرزاں مقابل آئی
راجا نے نگاہ کی غضب سے	پوچھا کہ یہ بے حیائی کب سے
بو آتی ہے آدمی کی لیجاؤ	ناپاک ہے آگ اسے دکھلاؤ
شعلہ سا پری کا جسم کانپا	مُنہ دامنِ اشک تر سے ڈھانپا
پریوں نے کشاں کشاں نکالا	صندل آتش کدے میں ڈالا
کافور سی جل اُٹھی سراپا	ٹھنڈی ہوئیں تھا جنھیں جلاپا[۵۲]
جو آتشِ گل نہ لے چمن سے	جھونکا اُسے آگ میں جلن سے
جس رُخ پہ تھی کاکُلِ معنبر	تھا چشم زدن میں دود اخگر

۵۱ "خواب کردن" کا ترجمہ ہے۔ نسیم کے زمانے میں اکثر شعرا فارسی محاورات کے ترجمے بالقصد کیا کرتے تھے اور بعض خوش مذاق اب بھی اسکی کوشش کرتے ہیں۔ ممکن ہے اس حیثیت سے "خواب کرتے" پر کوئی اعتراض نہ کیا جا سکے۔ آتش سہ

انتظارِ ملک الموت میں بیدار ہوں میں + بخت خفتہ کو مرے خواب گراں کرنے دو

۵۲۔ جلاپا۔ رشک و حسد۔ ٹھنڈی اور جلاپا میں صنعت طباق ہے۔

جس جسم پہ تھی نفیس پوشاک — شعلے کے سوا نہ کچھ بھی تھا خاک
عیسیٰ نفس ایک خضر آئی — چھینٹے سے جلی ہوئی جلائی
شعلے سے زیادہ پاک داماں — آکر ہوئی انجمن میں رقصاں
ناچی گائی غریب ناچار — اغیار ادا سے کر لیے یار
برخاست کا وقت صبحدم تھا — راجا وہ کہ صاحبِ کرم تھا
بولا جا یوں ہی آئیو روز — جل بجھ کے سدا سنائیو سوز
رخصت پاتے ہی وہ ہوائی — پرّاں پرّاں ہوا سی آئی
پشواز کنار حوض اُتاری — شب کی پوشاک پہنی ساری
بیتاب آرام گہ تک آئی — ہمخواب کی آنکھ بند پائی
یوں سیج پہ آکے سوئی بیتاب — جس شکل سے آئے آنکھ میں خواب
وہ آ ہوئے مست خوابِ خرگوش — یعنی تاج الملوک بے ہوش
اُس شب کو بغل میں آ کے جاگا — پر دوسری شب وہ جا کے جاگا
دیکھا تو وہ متصل نہیں ہے — پہلو میں جگر کے دل نہیں ہے
حاجت[1] کے گماں سے جب ہوئی دیر — جھنجلا کے پلنگ[2] سے اُٹھا شیر
دائیں دیکھا نظر نہ آئی — بائیں دیکھا کہیں نہ پائی[3]

---

[1] "حاجت" کے گماں سے" یعنی خیال یہ تھا کہ حوائج ضروریہ کرنے کے لئے گئی ہوگی۔

[2] پلنگ بمعنی چارپائی اور پلنگ بمعنی شیر کی تجنیس خطی کے لحاظ سے شیر نظم کیا گیا ہے۔

[3] "کہیں نہ پائی" غلط ہے "کہیں نہ پایا" ہونا چاہئے تھا یا "کہیں نہ ملی" لیکن غالباً قافیہ کی مجبوری سے "نہ پائی" نظم کیا ہے اور ممکن ہے نسیم کے وقت تک فعل کا اس صورت میں استعمال جائز ہو مصرعہ ثانی اصلاح بھی ہو سکتا تھا۔ ع بائیں دیکھا مگر نہ آئی۔

عورت تھی گمان بد سے کھٹکا — جانا کہیں دل کسی سے اٹکا

اژدر نظر آیا در کا سایہ — سمجھا وہ پلنگ چارپایہ

آنکھوں میں جو چھا گیا اندھیرا — پَل مارتے ہو گیا سویرا

جاگا تو پری بغل میں پائی — وہ[۵۱] نقش وفا عمل میں پائی

دانستہ خبر ہوا نہ بیتاب — گویا کہ وہ شب کا حال تھا خواب

جب مہر فلک گیا لبِ بام — مہتابی پہ آیا وہ سرِ شام

معمول سے بزم میں ہوئے جمع — مینا و کباب و مجمر و شمع

جام اُس نے بھرا کہا پیا[۵۲] لے — دل اُس کا بھرا تھا جام کیا لے

ٹھانی تھی کہ آج رہ کے بیدار — دیکھوں جاتی کہاں ہے عیّار

بولا کہ ہیں درد سر کے کچھ طور — میں آج نہ ہونگا شاملِ دور

ہٹ اُس نے جو کی تو ہاتھ مارا — شیشہ ہوا چور چور سارا

ہوتی ہے جو نوکِ شیشہ نشتر — چرکے لگے اُسکی اُنگلیوں پر

بید[illegible]یِ شب کی گھات پائی — حکمت سرِ دست ہاتھ آئی

کف میں نمکیں کباب لے کر — چھڑکا نمک اُن جراحتوں پر

بند آنکھیں کئے ہوئے شکرلب — بیدار رہا تو آخر شب

---

۵۱ "وہ نقش وفا عمل میں پائی" کی ترکیب غلط ہے۔ "اُس نقشِ وفا کو عمل میں پایا" یا "وہ نقش وفا عمل میں تھی" ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن نسیم کے وقت تک فعل کا اس صورت میں استعمال ممکن ہے جائز رہا ہو۔ "نقش" تعویذ کو بھی کہتے ہیں۔ اسلئے "نقش" اور "عمل" میں صنعت مراعات النظیر ہے۔

۵۲ جام اور پیالے کی رعایت لفظی کی وجہ سے۔ پیا۔ لے نظم کیا گیا ہے۔ پیا مشہور ہندی لفظ ہے جو عورت اپنے معشوق کیلئے استعمال کرتی ہے۔ لکھنؤ میں بھی "جانِ عالم پیا" کا لفظ مشہور ہے۔

پریوں نے ہوا سے تخت اُتارا ثابت ہوا ٹوٹتا ستارا

سوتا اسے جان کر اُٹھی وہ پوشاک بدلنے کو گئی وہ

اُس تخت کا یہ پکڑ کے پایہ پوشیدہ ہوا برنگ سایہ

بن ٹھن کے جب آئی رشکِ ناہید ذرہ ہوا ہمرکاب خورشید

جاتے ہی زمیں سے آسماں پر پہونچی اُس بزم میں سماں پر

لوگوں سے بھرا وہ دائرہ تھا پُرصوت و صدا وہ دائرہ تھا

ٹھیکے پہ پہنچ کے تخت ٹھہرا مرکز پہ وہ نجم بخت ٹھہرا

آتشکدہ پریوں نے بنا کر پھینکا اُسے پھول سا اُٹھا کر

شہزادہ کہ زیر تخت زر کار تھا پہلوے گُل میں صورتِ خار

فریاد نہ کرنے پایا مضطر تاباں ہوئے راکھ میں سے اخگر

راجا جس رُخ تھا محفل آرا دل لیتی ہوئی چلی دل آرا

ہمراہ چلا وہ چھوڑ پایہ آگے تھی پری تو پیچھے سایہ

محفل میں جو آئی شمعِ محفل پروانوں کا ہاتھ سے گیا دل

جو گاتی تھیں بیٹھیں مثلِ آواز مجرے کو اُٹھی وہ صورتِ ناز

وہ ناچنے کیا کھڑی ہوئی تھی خود راگنی آ کھڑی ہوئی تھی

رقص اُسکا اگرچہ خوشنما تھا سنگت کا پکھاوجی تھکا تھا

---

۵۱ اجرام فلکی کے لئے "ثوابت" - "سیار" مشہور الفاظ ہیں۔ اس شعر میں ستارہ کیلئے ثابت اسی رعایت لفظی کے لحاظ سے نظم کیا گیا ہے۔

۵۲ "سماں" پر یعنی محفل میں ایسے وقت پہونچی جب سماں بندھا ہوا تھا۔

شہزادے نے دیکھ دائیں بائیں — لیں طبلہ نواز کی بلائیں

آہستہ کہا کہو تو آؤں — فرماؤ تو بندگی بجاؤں

اُس نے جو پکھاوج اُسکو دیدی — کیفیت اتفاق نے دی

تھا سم پہ یہ اُس پری کا نقشا — سب آنکھ ملاکے کہتے تھے آ

محظوظ کیا جو سب کو یکبار — بخشا راجا نے نو لکھا ہار

انداز سے اُس نے لے کے مالا — کاندھے پہ پکھاوجی کے ڈالا

برخاست کا تھا وہ رخصتی ہار — برہم ہوئی بزم اُٹھے سب اکبار

بے ہار وہ شاہزادہ فی الفور — پنہاں ہوا زیر تخت اُسی طور

بادِ سحری چلی جو سَن سے — وہ شمع سدھاری انجمن سے

خورشید سے پہلے اُڑ کر آئی — تاروں کی چھاؤں میں گھر آئی

وہ حوض کے رُخ چلی اُتر کر — یہ آنکھ بچا کے سوئے بستر

وہ آئی تو غافل اُسکو پایا — آغوش میں آ گلے لگایا

جب پردہ صبح ہو گیا فاش — خنداں خنداں اُٹھا وہ بشاش

اُس غنچہ دہن کا مُسکرانا — بیرنگ بکاولی نے جانا

ہنستے ہنستے کہا ہنسے کیوں — ہنستا نہیں بے سبب کوئی یوں

بولا کہ وہ خواب دیکھتا تھا — آتش پہ کباب دیکھتا تھا

بولی وہ کہ ہم بتائیں تعبیر — دل سوزی کرے گا کوئی دلگیر

بولا وہ کہ رات کو اُفق میں — خورشید تھا آتشِ شفق میں

بولی وہ کہ مہر سے شب و روز — عالم میں رہو گے رونق افروز

بولا وہ کہ اک مقام ہو تھا — گلزار خلیل روبرو تھا

بولی وہ بشر ہو تم دلاور — سرسبز ہو قوم آتشی پر

بولا وہ کہ دیکھی اک شبستاں — شعلہ ہوا انجمن میں رقصاں

بولی وہ کہ شعلہ میں پری ہوں — جو ناچ[1] نچاؤ ناچتی ہوں

بولا وہ کہ جب ہوا اُجالا — بخشا مہ انجمن نے ہالا

ہالہ مہ انجمن کا کیا تھا — وہ ہار تھا جو گلے پڑا تھا

گھبرائی پری کہ ہیں یہ کیا ہے — بولا کہ وہ ہار تو لکھا ہے

کاندھے پہ تھا جسکے رات ڈالا — پہچانتی ہو وہ طبلے والا

کیوں جی یہ اکیلے شب کو جانا — اوپر اوپر مزے اُڑانا

یہ سُن کے پری وہ سوختہ تن — بولی کہ سُن اے صلاح دشمن

میں جاکے جلی تو غم نہیں ہائے — ڈر ہے کہ نہ تجھ پر آنچ آجائے

میرے جلنے پہ خاک ڈالو — تم نام نہ واں کے چلنے کا لو

افروختہ آتشِ حسد ہے — جلنا یہ سپند چشم بد ہے

بولا وہ کہ یہ نہ ہوگا مجھسے — میں دو قدم آگے ہونگا تجھسے

سمجھاتی رہی اُسے وہ دانا — لیکن اُس نے کہا نہ مانا

عازم ہوا شب کو آتے ہی تخت — یا قسمت یا نصیب یا بخت

واں جاکے وہ سوچی اُسکو بے لاگ — بے چلئے تو راجہ لائیگا راگ[2]

---

[1] یعنی ہر کام تمہاری مرضی کے موافق کرتی ہوں۔

[2] جھگڑا فساد کرنا۔

سنگت کا پکھاوجی بنا کے — گائی یہ غزل مقام[1] پا کے

غزل

ساقی قدحِ شراب دیدے ۱ مہتاب میں آفتاب دیدے

ساقی باقی جو کچھ ہوئے ہے ۲ باقی ساقی شراب دیدے

اُس بت سے نہیں سوال کچھ اور ۳ اپنے مُنہ سے جواب دیدے

لیلیٰ میں نے تجھے بنایا ۴ مجنوں مجکو خطاب دیدے

اُس گُل سے نسیم زر نہیں مانگ[2] ۵ جو چاہے وہ بیحساب دیدے

نصف پتھر کا ہو جانا بکاؤلی کا راجا اندر کی بد دعا سے اور بتخانے میں رہ کر ملنا تاج الملوک سے اور کھدنا بتخانے کا رانی چتراوت کے حکم سے

ہے اب جو بیان سنگ ساری — یوں پائے قلم ہوا ہے بھاری

خوش لہجہ بہت بکاؤلی تھی — گائنی[3] اور ناچنی بڑی تھی

---

۱ "مقام پاکے" یعنی موقع پاکے۔

۲ نہ مانگ ہونا چاہئے تھا۔ اُس گُل سے نسیم تو نہ زر مانگ۔

۳ نسخہ مطبع مجتبائی میں "گاتی اور ناچتی" ہے اور نسخہ چکبست میں "گاتی اور ناچتی" ہے۔ لیکن نسیم نے شاید گائنی اور ناچنی ہی نظم کیا ہو۔ یعنی گانے والی اور ناچنے والی ۔ چکبست نے بھی گائنی اور ناچنی کو صحیح تسلیم کیا ہے اور اسکی صحت کے ثبوت میں میر انیس کی رباعی کا مصرعہ ع ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی پیش کیا ہے۔

راجا نے کہا کہ خوش ہوں تجھسے　　جو چاہے آج مانگ مجھسے

دکھلا کے اُسی پکھاوجی کو　　مانگا کہ یہ دو بکاؤلی کو

ارمان یہی ہوس یہی ہے　　خاطر کی مراد بس یہی ہے

مانگا جو بشر پری نے بیباک　　راجا اندر ہوا غضب ناک

بولا کہ اس آدمی کی یہ تاب　　اے چشمۂ آفتاب سے آب

کھویا تجھے تیری آرزو نے　　جا تیری سزا یہی کہ تو نے

کی ہے حرکت خلافِ آئیں　　پتھر کا ہو نصف جسم پائیں

اس سختی سے کچھ دنوں رہے تو　　بعد اُسکے خاک میں ملے تو

قالب ترا انقلاب کھائے　　جامے میں تو آدمی کے آئے

بارہ برس اس طرح گزر کر　　پھر تجکو ملے پری کا پیکر

اُسوقت جہاں تو چاہے جائے　　تو اُسکو ملے وہ تجکو پائے

روئی وہ بکاؤلی یہ سُن کے　　تڑپا شہزادہ سر کو دُھن کے

خواہش جو بلائے جاں ہوئی وہ　　ہلکا ہوا یہ گراں ہوئی وہ

ناری تھی پری ہوا بتائی　　خاکی تھا بشر زمیں جھنکائی

سایہ سا زمیں پہ جب گرا وہ　　افتاد کو سوچنے لگا وہ

سبزے کی دھوپ چھانوں مخمل　　صحرا میں بچھی تھی سو گیا شل

چشمہ اک آفتاب سا تھا　　عاشق کی طرح بھرا ہوا تھا

پریاں کچھ ادھر نہانے آئیں　　دیکھا وہ بشر تو کھلکھلائیں

بولیں یہ وہی پکھاوجی ہے　　عاشق جس پر بکاؤلی ہے

وہ چونک کے بول اُٹھا کہ للہ — بتلاؤ کہاں ہے وہ کہا آہ

اندر کے غضب سے بنکے پتھر — ہے بت سی وہ ایک مٹھ کے اندر

پوچھا کہ کدھر کہا بہت دور — بولا وہ کہ پھر۔ کہا کہ مجبور

یہ کہکے اُتاری سبنے پوشاک — باہر ہوئیں جامے سے وہ بیباک

پردے کا جو کچھ خیال آیا — تن چادرِ آب سے چھپایا

بے ننگ یہ سب نہا رہی تھیں — موجیں[۵۱] باہم اُڑا رہی تھیں

سوچا وہ کہ ان کو دیجئے جُل — خس پوش کئے وہ جامۂ گُل

جب خوب وہ شعلہ رو نہائیں — باہر بصد آب و تاب آئیں

پوشاک دھری ہوئی نہ پائی — جانا کہ حریف نے اُڑائی

جُھک جُھک کے بدن چراتی آئیں — رُک رُک کے قدم بڑھاتی آئیں

دکھلائی کسی نے چشم جادو — چمکائی کسی نے تیغ ابرو

جھنجلا کے کہا کہ لاؤ مانو — ہمکو بھی بکاؤلی نہ جانو

بولا وہ یہ خوش تم ایسی کیا ہو — ڈرنے کا نہیں میں کیا بلا ہو

پوشاک جو لینی ہو تو پہنچاؤ — بولیں وہ چلو کہا قسم کھاؤ

عریانی کی ننگ سے لجائیں — ستار[۵۲] کی قسمیں سب نے کھائیں

---

۵۱ موجیں اُڑا رہی تھیں۔ خوش فعلیاں کر رہی تھیں۔

۵۲ ستار۔ بمعنی چھپانے والا۔ خدا کو ستار کہتے ہیں۔ اور منجملہ اسمائے حسنے ستار بھی خدا کا نام ہے۔ کیونکہ وہ لوگوں کے عیوب چھپاتا ہے ستر اصطلاح فقہ میں اُس حصہ جسم کو کہتے ہیں جسے کھلا نہ رہنا چاہئے۔ اس موقع پر خصوصیت کے ساتھ ستار اسی رعایت لفظی کے خیال سے استعمال ہوا ہے جو عریانی اور ستر میں موجود ہے۔

شہزادے نے کرکے پاس اُنکا　　خلعت سا دیا لباس اُنکا
پریاں ہوئیں رخت سج کے خرسند　　ہو جیسے ہوا حباب میں بند
شانے پہ چڑھا کے مثل گیسو　　اُس گل کو اُڑایا صورتِ بو
واقف اُس بتکدے سے تھیں وہ　　سنگلدیپ اُس کو لے گئیں وہ
وہ جائے بکاؤلی بتائی　　دیوانے کو باؤلی بتائی[۱]
بتخانے میں تھا طلسم کا در[۲]　　ششدر ہوا چار سمت پھر کر
عقدہ کھلا شام ہو کر اُسکا　　شق[۳] مثلِ قمر ہوا در اُسکا
دیکھا تو وہ بت تھی مٹھ کے اندر　　جسم آدھا پری تھا آدھا پتھر

بکاؤلی ناف تک پتھر کی ہو گئی تھی

چومے جو قدم اُس آدمی نے　　سینے سے لگا لیا پری نے
زمی سے کہا بخیر گزری　　کس سختی سے تم بغیر گزری

---

۱ باؤلی بتانا - چکمہ دینا - باؤلی کا استعمال دیوانے اور باؤڑے کی رعایت لفظی کی وجہ سے ہے - چونکہ پریوں نے ٹھیک موقع پر پہونچا دیا تھا اسلئے باؤلی بتانے کا محاورہ بے محل معلوم ہوتا ہے لیکن بعد کا شعر ملا کر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ طلسم میں پڑ کر حیران ہوا اس لحاظ سے باؤلی بتانا استعمال کیا گیا ہے -

۲ چونکہ پہلے مصرع میں "در" ہے لہذا دوسرے مصرع میں ششدر مناسبت لفظی کے خیال سے نظم کیا گیا اور ششدر کیلئے چار سمت -

۳ حضرت رسول مقبول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں ایک معجزہ شق القمر بھی ہے کفار عرب میں سے کسی نے بطرز امتحان آپ سے یہ سوال کیا تھا کہ اگر آپ سچے نبی ہیں تو چاند کے دو ٹکڑے کر دیجئے آپ نے فرمایا کہ خدا میں سب قدرت ہے - اور انگشت شہادت سے اشارہ فرمایا - چاند دو ٹکڑے ہو کر نصف ایک سمت ہو گیا اور نصف دوسرے سمت - اس شعر میں دروازہ شق ہونے کی تشبیہہ شق القمر سے دی ہے جسمیں اس معجزہ کیطرف اشارہ ہے

ہمپر تو پڑے وہاں یہ پتھر — تم کیونکہ بچے کہا مقدر

گر پڑکے زمیں پہ مثلِ شبنم — پھر پریوں کی مہر[1] سے اُڑے ہم

جذبہ تم پاس کھینچ لایا — سختی اب دور ہو خدایا

تا آخرِ شب فسانے کہکر — بولی وہ پری کہ اے دلاور

یہ درماندِ چشمِ بے خواب — ہوتا ہے سحر کو بند بیتاب

پیش از دمِ صبح تم نکل جاؤ — کل پھر سرِ شام خیر سے آؤ

مصرف کو جو ہو ضرورتِ زر — زیور مرا مجھسے لو یہ کہکر ہا

کانوں میں سے موتی کچھ نکالے — دامن پہ مثال اشک ڈالے

صدقے وہ بشر ہوا پری کے — قدموں پہ گرا بکاؤلی کے

پاؤں اُسکے چھوئے تو یخ سے پائے — آنسوں چھوڑے گہر اُٹھائے

نکلا جیسے ہی مٹھ کے باہر — پتھرا گئی چشم حلقۂ در[2]

آنکھوں سے یہ دیکھنا ہوا قہر — آگے کو بڑھا چلا سوئے شہر

بازار میں جاکے بیچے گوہر — مفلس سے ہوا وہ صاحبِ زر

گھوڑا جوڑا نفر حویلی — جو جو شے چاہئے تھی لے لی

جب منزلِ شب میں رہروِ روز — لے گوہرِ شبنم آیا پر سوز

---

[1] مہر بمعنی عنایت و آفتاب۔ چونکہ شبنم آفتاب کی حدت سے بخارات کی صورت میں اڑکر ہوا میں مل جاتی ہے اسلئے مطلب تو یہی ہے کہ میں پریوں کی مہربانی سے اڑکر یہاں تک پہونچا ہوں ۔ چونکہ اپنی مثال شبنم سے دی ہے لہذا عنایت و مہربانی کے بجائے خصوصیت کے ساتھ "مہر" نظم کیا ہے جو ذو معنی ہے ۔

[2] پتھرا گئی چشم حلقۂ در مطلب یہ ہے کہ دروازہ جس طرح پہلے بند تھا پھر بند ہو گیا۔

گنبدِ گردوں کا تھا جو بے در — تاباں ہوئے اُس میں ماہ و اختر
سیاروں سے کر کے استخارا[1] — اُس بُرج کے رُخ وہ مہ سدھارا
دیکھا تو درِ قبول وا تھا — رگڑا اُنھیں ایڑیوں پہ ماتھا
شب سایۂ زلف میں بسر کی — لی صبح کے ہوتے راہ گھر کی
تقدیر نے راستا بھلایا — راجا کے محل کے جانب آیا
چترا وت اُس کی ماہ پارہ — غرفے[2] میں سے کرتی تھی نظارہ
دیکھا تو جوان تھا یہ تصویر[3] — صورت پہ فدا ہوئی وہ بے پیر
یاں پردہ درِ نظر سے گزرا — واں تیرِ نظر جگر سے گزرا
دستور تھا جس کو بیٹی چاہے — باپ اُس کا اُسی کے ساتھ بیاہے
راجا سے خوش خبر بیاں کی — مشاطۂ[4] خوش ادا رواں کی
شادی کی خبر سے وہ یکایک — خوش خوش آئی کہا مبارک
اِس شہر کا چترسین راجا — دختر رکھتا ہے ماہ سیما
ہر ملک کے شہریار آئے — ہر شہر کے تاجدار آئے

---

[1] استخارہ کرنا۔ بمعنی فال دیکھنا۔ اسمیں دو لطافتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ۱۔ استخارہ تسبیح سے کیا جاتا ہے اور تسبیح کے دانوں اور ستاروں میں مشابہت ہے ۲۔ چونکہ نسیم ہندو تھے اسلئے بعید نہیں کہ یہ بات بھی ملحوظ رکھی ہو کہ آئندہ واقعات کا علم ذریعہ جوتش ستاروں سے بھی ہوتا ہے۔

[2] جھروکھا۔

[3] کسی خوبصورت چیز کی انتہائی تعریف یہ کیجاتی ہے کہ گویا تصویر ہے اسلئے تصویر کہنا شہزادہ کی خوبصورتی کیطرف اشارہ ہے۔

[4] اُن عورتوں کو کہتے ہیں، جو کپڑے پہنانے اور سنگار کرنے کی خدمت پر مامور ہوتی ہیں اور اُن عورتوں کو بھی کہتے ہیں جو شادی کے پیغام لیجاتی ہیں۔

راضی تجھسے ہوئی وہ بے پیر — طالع قسمت نصیب تقدیر

بیجا[۵۱] وہ ہوا کہا کہ جا جا — کیسی رانی کہاں کا راجا

دکھلا نہ مجھے ہرے ہرے باغ — غنچے کی گرہ میں کیا ہے جز داغ

الفت میں ہے آبرو گنوانی — کب چشمۂ مہر میں ہے پانی

مکار تو مجھسے کرتی ہے زور[۵۲] — دُر ہو مرے سامنے سے چل دور

ہٹ دیکھ کے اسکی ہٹ گئی وہ — قسمت کی طرح پلٹ گئی وہ

پایا جو جواب منتظر نے — آنکھوں میں لگا خیال پھرنے

تقدیر کی بات ہونے والی — زر سے ہوا اُسکا ہاتھ خالی

من سانپ کا ران سے نکالا — بازار آیا وہ سروِ بالا

کیا جوہری مول کرتے اُسکا — راجا تک رفتہ رفتہ پہنچا

جو مدعیوں کا مدعا تھا — موقع وہ ملا تو کیا بُرا تھا

جنجھلا کے ڈرا کے غل مچا کے — سمجھا کے دبا کے دست پا[۵۳] کے

من چھین کے چوری کے بہانے — بھیجا کھُلے بندوں قید خانے

زنداں میں وہ نیم جاں وہ بسمل — زنجیر میں پاؤں زلف میں دل

غم کھا کے لہو کے گھونٹ پینا — دم دیکھے دھاگوں سے ہونٹھ سینا

داروغۂ محبس جفا نے — رانی سے کہا کسی بہانے

یوسف کی خبر ہے او زلیخا — زنداں میں ہے وہ عزیز مرتا

---

۵۱ بیجا ہوا۔ خفا ہوا کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اسے مباحثۂ گلزار نسیم میں تحریف کیا گیا ہے اور بجائے بیجا کے تیکھا بمعنی ترش رو ہونا بتایا گیا ہے۔ ۵۲ زور بمعنی مکر۔

۵۳۔ دست پا کے بمعنی موقع پا کے۔ اسمیں دست اور "پا" کی رعایت لفظی ہے۔

اس چاہ میں کام ہو نہ جائے | یہ ماہ تمام ہو نہ جائے
دانا تھی وہ جہلخانے آئی | بگڑے ہوئے کو منانے آئی
دیکھا تو سرنگوں تھا دلگیر | تھی حلقہ بحلقہ زلف و[1] زنجیر
آنکھ اُس سے نہ جب ملائی اُس نے | زنجیر اُس کی ہلائی اُس نے
پابند بلا وہ مبتلا تھا | کب اُس کو خیال بندِ پا تھا
رانی نے جو بیدلی نگہ کی | بیڑی کٹوائی بے گنہ کی
قدموں پہ گری کہا اُٹھو آؤ | انکار و گریز جانے دو آؤ
اُٹھا وہ پری کی آرزو میں | یہ سمجھی کہ پھانسا گفتگو میں
وہاں دھن کہ صنم سے کدخدا ہوں | یہاں دھیان کہ بت کا پارسا ہوں
تجویز میں اپنے اپنے مفہوم | آئی تو محل میں مچ گئی دھوم
راجا نے ستارہ داں بلایا | سعدین[2] کا زائچہ ملایا
دن ڈھلکے وہ ماہ نو سرِ شام | غائب ہوا سیر کر کے کچھ گام
دروازے کا مٹھ کہ دیدہ وا تھا | توبہ کا در کھلا ہوا تھا
آیا تو وہ کب سے تکتی تھی راہ | دیکھا تو کہا کہاں رہے واہ
دیکھے جو حنائی ہاتھ بے لاگ | تلووں سے پری کے لگ گئی آگ
پوچھا کہ بن آئی کس بنی کی | کس راہ کی زن نے رہزنی کی

---

[1] نسخہ نظامی پریس میں اسی طرح چھپا ہے۔ اور چکبست کے نسخے میں بھی یوں ہی ہے۔ لیکن زلف پر (ن) علامت نسخہ ظاہر کر کے حاشیہ پر چشم تحریر ہے۔ یعنے تھی حلقہ بہ حلقہ چشم و زنجیر۔

[2] جب دو مبارک ستارے ایک برج میں جمع ہو جاتے ہیں تو اسکو قران السعدین کہتے ہیں۔

توفیق یہاں تلک جو لاتی   مہندی پاؤں[۵۱] کی گھس نہ جاتی
قدموں سے لگا پسا[۵۲] ہوا وہ   مہندی کا جو رنگ تھا کہا وہ
رانی کی وہ مہر و سر گرانی   راجا کی وہ قہرِ حکم رانی
من بیچتے اپنا قند ہونا   داموں کے لئے وہ صید ہونا
چتراوت کا وہ آپ آنا   سب کہکے کہا خدا ہے دانا
شادی نہیں کچھ خوشی سے مانی   بے تیرے تھی مرگ زندگانی
غم تھا کہ ترے قدم سے چھوٹا   شادی کے بہانے غم سے چھوٹا
بیاری یہ نہیں حنائی چنگال   ہاتھ ایسے ملے کہ ہوگئے لال
زنجیروں سے پاؤں ہے نکالا   زلفوں پہ نہیں یہ ہاتھ ڈالا
کاٹے ڈسیں بال اگر چھوئے ہوں   چھالے پڑیں گال اگر چھوئے ہوں
بگڑی وہ کہ چل بنا نہ باتیں   مجھسے کوئی سیکھے ایسی گھاتیں
میری تجھے ایسی کیا لگی تھی   تلوں[۵۳] سے تیرے حنا لگی تھی
تنگ آیا تو دیکھ قیدخانا   آسان نہیں کڑی[۵۴] اُٹھانا
پتھر کی اگر کہو تو میں ہوں   فولاد جگر کہو تو میں ہوں
سہتی ہوں جہاں کی سخت سستی   آسائشِ جان تندرستی

---

۵۱ پاؤں کی مہندی نہ گھس جاتی محاورہ ہے۔ یعنی زیادہ تکلیف نہ ہوتی۔

۵۲ پسا ہوا۔ مصیبت زدہ۔

۵۳ تلووں سے لگنا محاورہ ہے یعنی کسی کام کی بڑی فکر کرنا۔

۵۴ کڑی اُٹھانا محاورہ ہے۔ بمعنی مصیبت جھیلنا۔

اس تنگ قفس کو سمجھی ہوں باغ   سنگینی گراں نہ جلنے کا داغ
قسمت سے مقر ہے اب نہ مامن[51]   پتھر کے تلے دبا ہے دامن[52]
کب چاہے گی عقل مصلحت سنج   تم تو کرو شادی ہم کریں رنج
راضی ہیں خدا کی جو رضا ہو   ہوتی ہے سحر چلو ہوا ہو[53]
وہ معتقد اُسکے پاؤں چھو کر   اُٹھا چھاتی پہ رکھ کے پتھر[54]
آیا تو وہ نوعروس زیبا   بستر پہ تھی شکل نقش دیبا
نیند آئی جو تھی بصد کدورت   تھی چین بجبیں شکن کی صورت
سوئی تو تھی انتظار میں وہ   جاگی تو ملا کنار میں وہ
سوتے جو کٹی شبِ جوانی   سو خفتہ نصیبی اپنی جانی
تھے صبح سے دونوں شام جویاں   شب کو ہوئے داخلِ شبستاں
دونوں تھے تصوروں میں کامل   خلوت خانہ تھا گوشۂ دل
دو آنکھوں کی طرح ایک جا تھے   پر دل جو ملا نہ تھا جدا تھے
کروٹ لے کر وہ عنبریں مو   اُٹھ چلنے کا سوچتا تھا پہلو

عروس خاموش پڑی ہوئی تھی

حیرت چھائی تو کھو گئی وہ   غفلت آئی تو سو گئی وہ

---

۵۱ مامن۔ امن کی جگہ

۵۲ پتھر کے تلے دامن دبا ہونا۔ کسی مصیبت میں مبتلا ہونا۔

۵۳ ہوا ہو۔ محاورہ ہے۔ یعنی بھاگ جاؤ۔

۵۴ چھاتی پر پتھر رکھنا۔ صبر کرنا۔

غافل اُسے چھوڑ کر اُٹھا یہ　　لپکا تو پری کے رُخ گیا یہ

یہ جاکے ہوئی وہ فتنہ بیدار　　دیکھا تو تھا تکیہ جائے دلدار

دوری نے جو حد سے کی درازی　　جانا کہ کہیں ہے عشق بازی

اُس رات کو چپکی ہو رہی وہ　　کل سمجھونگی کہہ کے سو رہی وہ

وقتِ سحر اسکو پاکے رانی　　ہم بسترِ خواب سرگرانی

خلوت خانے سے باہر آئی　　دربانوں کے پاس در پہ آئی

حکم اُن کو دیا کہ شام کو آج　　جانا ہمراہ صاحبِ تاج

سائے کی طرح سے ساتھ رہنا　　جو آنکھ سے دیکھنا وہ کہنا

جس وقت چلا پری کا مانوس　　سایہ سے پسِ قدم تھے جاسوس

وہ مٹھ وہ پری مقام دیکھا　　وہ بُرج وہ مہ تمام دیکھا

اک اُن میں سے رانی پاس آیا　　کی عرض کہ لو سُراغ پایا

صورت یہ ہے جو نگاہ کی ہے　　اک مٹھ میں مورت اک پری ہے

آنکھوں سے اُس انجمن کو دیکھا　　یکجا بت و برہمن کو دیکھا

لعل و گہر ایک دُرج میں ہے　　شمس و قمر ایک بُرج میں ہے

آنکھ اُسکی یہ سُن کے خوں میں ڈوبی　　مریخ[1] بنی وہ ماہ خوبی

یہاں اس نے کہا وہ برج کھدواؤ　　وہاں بولی بکاؤلی کہ لو جاؤ

یہاں سے چلے لوگ واں سے وہ زار　　لپکا یہ اِدھر اُدھر وہ خونخوار

---

[1] مریخ ایک ستارہ ہے کہا جاتا ہے کہ کشت و خون اُسی کے اثر سے ہوتا ہے۔

توڑا وہ منھ حباب آسا — پھوڑا جلے[1] دل کا آبلہ سا

شہزادے کے آگے بے حیا نے — انعام دیا کھُلے خزانے

پاس اُسکا ذرا نہیں کیا کچھ — اور اُس سے کہاکہ لو سُنا کچھ

بنیاد فساد کھود ڈالی — جاسوسوں نے کھود کر نکالی

غائب رہتے تھے روز شب بھر — اب دیکھو گے جاکے خاک پتھر[2]

سُنتے ہی وہ بیقرار لپکا — دوڑا بے اختیار لپکا

دیکھا تو وہ ماہرو نہ وہ بُرج — وہ لعلِ گراں بہا نہ وہ دُرج[3]

شور اس نے کیا کہ کیا یہ شر ہے — آواز آئی کہ بے خبر ہے

بنیاد برافگنی کی بانی — ہے سوت مری وہ تیری رانی

کھدوایا جب اُس نے منھ بصد جور — رہنے کو ملا ہمیں مکان اور

واں ٹھوکریں کھائی سخت تھیں تنگ — شکست بجائے خویشتن سنگ

ہونا تھا یہی تو شکوہ کیا ہے — جا کچھ دنوں صبر کر خدا ہے

حیرت زدہ چپ خموش سنسان — ٹوٹا ہوا دل بندھا ہوا دھیان

آیا تو ہنسی وہ شوخ رانی — گویا وہ ہوا بخوش بیانی

---

[1] دل کے جلے پھپھولے پھوڑنا محاورہ ہے اور اُس موقع پر استعمال کیا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص اپنے رنج وغم کا اظہار غصہ کی شکل میں کرتا ہے۔

[2] خاک پتھر۔ محاورہ ہے۔ یعنی وہاں اب کچھ نہیں ہے کیا دیکھو گے۔ اور یہ بھی مطلب ہے کہ وہاں اب خاک پتھر کا ڈھیر ہے

[3] دُرج۔ ڈبہ مراد مندر سے ہے اور لعل گراں بہا کنایہ ہے بکاؤلی سے

تقدیر کو گُل کھلانا تھا یوں — تو خار سے بیخ کن ہوئی کیوں

دوراں کو تھا انقلاب منظور — مختار خدا ہے بندہ مجبور

دو شعر نکالدے گئے مطلب یہ ہے کہ اُس دن سے تاج الملوک

اور وہ رانی دونوں باہم آرام سے رہنے لگے

پیدا ہونا بکاؤلی کا دہقان کے گھر میں اور جوان ہو کر ملنا تاج الملوک سے

نقطوں سے ہے اب قلم کا دہقاں — صفحے کی زمیں پہ دانہ افشاں

جب مٹھ کی رہی نہ بیخ و بنیاد — جیسے کہ ہو گرد باد برباد

دہقاں تھے نئی زمیں کے جویا — سرسوں کا کھیت اُنھوں نے بویا

جب چین سے کرچکے تردد — کھیتی کی ہوئی زمیں پہ واشُد

دہقان کی زوجہ کے کُھلے بھاگ — کھانے لگی نوچ نوچ کے ساگ

کھاتے ہی حمل کا ڈھنگ پایا — سرسوں سا ہتھیلی پر جمایا

وہ بانجھ تھی جب حمل قبولی — سرسوں آنکھوں میں سب کے پھولی

ایام مقرری گزر کر — پیدا ہوئی اک حسینہ دختر

---

۵۱ گُل کھلنا محاورہ ہے۔ بمعنی کوئی نیا ذریعہ ہو جانا

۵۲ خار کھانا محاورہ ہے۔ بمعنی حسد کرنا۔

۵۳ واشُد ہونا۔ فصل کا اُگنا۔

۵۴ ہتیلی پر سرسوں جمانا محاورہ ہے۔ یعنی چٹ پٹ کوئی کام کرنا۔

۵۵ آنکھوں میں سرسوں پھولنا محاورہ ہے۔ یعنی بہت خوش ہونا۔

صورت میں پری جمال میں حور — فلفل سی وہ ماں تھی بیٹیں کافور
مشہور ہوئی وہ ماہ پارہ — لوگ آنے لگے پئے نظارہ
وہ منتظرِ ظہورِ نیرنگ — یعنی تاج الملوک دل تنگ
چرچا سن کر چلا کہ دیکھوں — دیکھا تو کھبا نظر میں افسوں
جانا کہ پری وہ سوختہ تن — سانچے میں سے ڈھلکے نکلی کندن
چہرے سے پری کا ڈھنگ پایا — اندر کا وہ قول یاد آیا
دہقاں سے کہا کہ سیم و زر لے — دولت صدقے یہ سیمبر دے
دہقاں نے کہا کہ میرے صاحب — یہ باتیں تمھیں نہیں مناسب
دختر جو پسند مہ لقا ہے — بکتی نہیں لعل بے بہا ہے
پھل سے نہیں پیڑ کو سروکار — جب تک کہ ہو کام کا نہیں یار

تاج الملوک کو بھی اسکی کمسنی کا خیال ہوا

یہ سوچ کے گھر پھرا وہ دلسوز — آیا گیا اسکو دیکھنے روز
دن دن اِسے ہو گیا قیامت — بوٹا سی بڑھی وہ سروِ قامت
چلتی تو زمیں میں سرو گڑتے[1] — باتیں کرتی تو پھول جھڑتے
خواہاں ہوئے ہم و قار اُسکے — دہقاں ہوئے خواستگار اُسکے
کہ بے سر و برگی اپنی دہقاں — بولا کہ ہے رب کے ہاتھ ساماں
شہزادے نے ایک دن پھر آ کر — شادی کو کہا حیا اُٹھا کر
دہقاں نے کہا کہ یا شہنشاہ — تم کو وہ وقار میں پرکاہ

---

[1] زمین میں گڑنا۔ شرمندہ ہونا۔

صحبت ہے برابری میں زیبا ‌ نسبت ہے براوری میں زیبا
دہقاں زادی وہ بے محابا ‌ بول اُٹھی کس آن سے کہ بابا
خواہاں سے مرے نہ ہوتو ناخوش ‌ ہے دخترِ رز نصیب میکش
مطلب کو سمجھ کے گھر پھرا وہ ‌ وقت آنے کا منتظر رہا وہ
یہاں تو یہ حساب کرتا تھا سن ‌ وہاں لوگ ارم کے گنتے تھے دن
گزرا بارے جو عہدِ سختی ‌ آئے ایامِ نیک بختی
دختر وہ پکڑ کے باپ کا ہاتھ ‌ پچھواڑے مکاں کے لے گئی ساتھ
وہاں تھا کسی وقت کا دفینہ ‌ دکھلا کے کہا یہ ہے خزینہ
کہنا نہ کسی سے میں پری ہوں ‌ تو کیا جانے بکاؤلی ہوں
ایک آدمی زاد کی بدولت ‌ لائی ترے گھر ہے مجکو قسمت
ناگاہ سمن پری لئے تخت ‌ وارد ہوئی اور کہا کہ لے رخت
رخت اُس نے سجکے تخت اُڑایا ‌ دامانِ نظر سے مُنہ چھپایا
چترا وت کا محل جدھر تھا ‌ سوتا جس رُخ وہ سیمبر تھا
واں جاکے ہوئی وہ نور آگیں ‌ پروانے کی اپنے شمع بالیں
بیدار کیا وہ ماہ پیکر ‌ جاگا تو تھا آفتاب[۱] سر پر
اُٹھا جو وہ کہکے آؤ جانی ‌ آواز سے چونک اُٹھی وہ رانی
منہ دیکھتے ہی بکاؤلی کا ‌ سایہ اُسے ہوگیا پری کا
بولی وہ بکاؤلی سیانی ‌ ہے سوت مری یہی وہ رانی

---

[۱] جاگا تو تھا آفتاب سر پر۔ بکاؤلی کے چہرے کو آفتاب سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی دیکھا تو بکاؤلی سرہانے کھڑی ہے۔

بولا وہ کہ لونڈی ہے تمہاری — یہ کہکے اُسے کہا کہ پیاری

چوٹی ہے مری تو ہاتھ انکے[1] — چل آکہ چلا میں ساتھ انکے

رانی نے کہا کہ گو یہ ہے غیر — میں تیری ہوں تو کسی کا ہو خیر

یہ بات بکاؤلی کو بھائی — شہزادے کے ساتھ اُسے بھی لائی

اُڑتے ہی وہ تخت سحر آگئیں — کیا دور تھا گلشن نگاریں

مدت کے جو بعد گھر میں آئے — کھوئے ہوئے جیسے سب نے پائے

فردوس کی بیسوا وہ دلبر — محمودہ دیونی کی دختر

چتراوت چترسین کی جان — آرام ارم بکاؤلی جان

ان چاروں میں ایک مست بادہ — پورب کا بادشاہزادہ

پانچوں سر پنجۂ وفا تھے — یا خمسۂ[2] مطلع صفا تھے

ہوتے ہی حواس خمسہ[3] مجموع — آمد ہوئی اقربا کی مسموع

فیروز شہ و جمیلہ دانا — حسن آرا اور روح افزا

پورب کا وہ شاہ شاہ بانو — اطراف سے مملکت کے میں تو

جو جو آیا بلا تکلف — اک قافلہ سے ملا وہ یوسف

سلطانوں کی قدر دانیاں کیں — مہمانوں کی میزبانیاں کیں

ھ۱ چوٹی ہے مری تو ہاتھ انکے۔ محاورہ ہے یعنی میں انکے قبضہ میں ہوں۔

ھ۲ خمسہ اُس نظم کو کہتے ہیں جسمیں پانچ مصرعے ہوں۔

ھ۳ حواس خمسہ۔ پانچوں حواس یعنی شامّہ[1] سونگھنے کی طاقت۔ باصرہ[2] دیکھنے کی طاقت سامعہ[3] سننے کی طاقت ذائقہ[4] چکھنے کی طاقت لامسہ[5] چھونے کی طاقت۔

چندے رہا مجمع بد و نیک ‎ ‎ رخصت ہوئے رفتہ رفتہ ایک ایک
روح افزا سے بکاؤلی کو ‎ ‎ الفت تھی روکی دل لگی کو
رکنا ہوا اُس پری کا مشکل ‎ ‎ یہ دل لگی اب لگا گئی دل

عاشق ہونا بہرام وزیر زادہ تاج الملوک کا روح افزا پری پر

اور شادی ہونا بکاؤلی کی سعی سے اور کامیاب ہونا

جب ختم پہ داستان آئی ‎ ‎ یوں شاخِ قلم شگوفہ[1] لائی
روح افزا کو بکاؤلی نے ‎ ‎ روکا جو یہاں کئی مہینے
یک شب کہ وہ زلفِ مہ رخاں تھی ‎ ‎ یا آتشِ مہر کا دخاں تھی
وہ مست مے فسانہ گوئی ‎ ‎ مہتابی پہ چاندنی سی سوئی
سلطاں کا وزیر زادہ بہرام ‎ ‎ گلگشت چمن میں تھا گل اندام
لٹکی دیکھی پری کی چوٹی ‎ ‎ ناگن سی اسکے دل پہ لوٹی[2]
کھٹکے سے مگر بکاؤلی کے ‎ ‎ بھاگا سایہ سے اُس پری کے
جب کاکلِ شب سے روئے خورشید ‎ ‎ تاباں ہوا بہر چشمِ امید
دیکھا تو ماہ نو کا تھا بُرج ‎ ‎ رکھتا تھا دُرِ یگانہ وہ دُرج
بیتابی نے کچھ قرار پایا ‎ ‎ مجبوری میں اختیار پایا

---

[1] شگوفہ بمعنی کلی۔ شاخ قلم شگوفہ لائی۔ یعنی ایک نیا سلسلۂ داستان شروع ہوا۔

[2] دل پر ناگن لوٹنا۔ محاورہ ہے یعنی نہایت پیچ وتاب کھانا۔

مہتابی پہ چاندنی جب آئی — سایے نے پری پہ کی چڑھائی
اُس فتنہ کی خواب گہ تک آیا — مانند سہا[۵۱] وہ مہ تک آیا
تجویز رہا تھا گھات گونگی — ناگاہ وہ مست خواب چونکی
آغوش کی موج سے وہ مضطر — مچھلی سی نکل گئی تڑپ کر
پیچھا کئے صحن تک وہ آیا — مہتاب کے پیچھے جیسے سایہ
ملتی اُسے خاک وہ ہوائی — انساں کو پری نہ ہاتھ آئی
ہوتے ہی سحر وہ روح افزا — رخصت ہوئی گھر کو رکھ کے پردا[۵۲]
معشوق سے رہ گیا جو ناکام — تھا غم سے کنار گور[۵۳] بہرام
تنہا وہ سمن پری تھی اک روز — قدموں پہ گرا کہا بصد سوز
دل سے ہوں فدائے روح افزا — مرتا ہوں برائے روح افزا
بولی وہ ارے بشر سڑی ہے — روح افزا کیا بکاؤلی ہے
شہزادے کے ڈھنگ پر نہ تو چل — ہمتائے فلک نہ ہوگا بادل
بولا وہ کہ مجھ سے اُس سے ہے راہ — شبنم کی ہے آفتاب کو چاہ
واقف تھی پری کے دیس سے وہ — لے پہنچی زنانے بھیس سے وہ
فردوس میں مالن ایک تھی حور — گلچہرہ پری بنفشہ مشہور

---

۵۱ سہا ایک چھوٹے ستارے کا نام ہے جب چاند کے قریب آتا ہے تو دکھائی دیتا ہے۔

۵۲ رکھ کے پردہ یعنی راز پوشیدہ رکھ کر۔

۵۳ کنار گور ہونا بمعنی مرنے کے قریب ہونا چونکہ بہرام گور بہت مشہور بادشاہ کا نام ہے اسلئے رعایت لفظی کے خیال سے اس بہرام گور کو کنار گور کہا گیا۔

پوشیدہ گھر اُسکے لائی اُسکو — منہ بولی بہن بتائی[1] اُسکو

فردوس کی سیر کے بہانے — چھوڑا منزل پہ رہ نمانے

روح افزا کے لئے بنفشہ — گلدستہ بنائی تھی ہمیشہ

حاجت کو ذرا گئی جو باہر — بہرام نے پشت آئینہ پر

تحریر کیا کہ بے مروت — آئینہ[2] ہے تجھ پہ میری صورت

افسوس مجھے تو آرزو ہو — اور آئینہ تیرے روبرو ہو

لیکن تو زبسکہ خود نما ہے — خود بینی سے جو کرے بجا ہے

یہ لکھ کے ہٹا تو مالن آئی — گلدستہ پری کے پاس لائی

روح افزا کا سنگار کرکے — محو اُس کی ہوئی جو پیار کرکے

اُلٹا اُسے آئینہ دکھایا — خط سمجھی وہ کاکلوں کا سایا

مضموں جو پڑھا پری تھی دانا — نقشِ عملِ نگار جانا

مشاطہ کو دیکھکر اکیلی — بولی کہ بتاؤ یہ پہیلی

ہاتھ[3] آکر جو نہ پائے وہ کون — ہوکر جو نظر نہ آئے وہ کون

---

[1] "بتایا اُسکو" ہونا چاہیئے تھا فعل کا اس صورت سے استعمال گلزار نسیم میں متعدد مقامات پر ہوا ہے جسے ہم کسی طرح سہو نہیں سمجھ سکتے پنڈت برج نراین چکبست نے متعدد مثالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نسیم کے زمانہ میں اسکا جواز تھا۔ [2] یعنی میری حالت تجھ پر ظاہر ہے۔

[3] معرکۂ چکبست و شرر کے ساتھ جو نسخہ چھپا ہے اُسمیں اس شعر کی کتابت اس طرح ہے

ہاتھ آکر جو نہ پائی وہ کون + ہوکر جو نظر نہ آئی وہ کون۔ اور نسخہ نظامی پریس میں ہے

ہاتھ آکر جو نہ پائے وہ کون — ہوکر جو نظر نہ آئے وہ کون

سوچی تو نہ بوجھی وہ کہا کل — کہدوں گی یہ کہکے آئی بیکل

بہرام اُس سوچ کو سمجھ کر — بولا کیا ہے کہا اُلجھکر

وہ جانتا تھا نہ اُسکو سوجھی — بولا لو بات کیا ہے. بوجھی

ہاتھ آکے نہ پائے جو وہ مجذوب — ہو کر نہ دکھائی دے وہ محبوب

وہ سُنکے جو دوسرے دن آئی — تقریر سُنی ہوئی سُنائی

سمجھی وہ کہ پوچھ آئی ہے یہ — پوچھا کس نے بتائی ہے یہ

بولی وہ کہ ہاں مجھے نہ سوجھی — منہ بولی بہن نے میری بوجھی

روح افزا نے کہا کہ ناداں — ہمراہ اُسے کیوں نہ لائی تو یاں

بولی وہ ابھی چلی میں لائی — جا کر طلبی اُسے سُنائی

اس مژدہ کا منتظر ہی تھا وہ — ساتھ اُسکے زنانے میں گیا وہ

امرد[1] کا لباس تھا زنانا — دھوکا کچھ کھا گئی وہ دانا

پوچھا کہو نام کیا۔ کہا ننگ — پوچھا کہ نشاں۔ کہا دل تنگ

یہ سُنکے اشارے سے بتایا — بادام[2] بنفشہ کو دکھایا

وہ[3] سمجھی کہا یہ پردہ پوشی — گندم کے بہانے جو فروشی

بہرام ہے تو ارے وہی چور — رہ تجکو بناؤں سحر سے گور

---

[1] نوجوان جسکے ڈاڑھی مونچھ نہ نکلی ہو۔

[2] شعرا معشوق کی آنکھ کو بادام سے تشبیہ دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بنفشہ (مالن) کو آنکھ سے اشارہ کیا۔

[3] مباحثہ گلزارِ نسیم کے ساتھ جو نسخہ چھپا ہے اُسمیں یہ مصرع اسطرح چھپا ہے ع وہ جانی کہا یہ پردہ پوشی اور "جانی" پر نشان دیکر حاشیہ پر "سمجھی" تحریر ہے یعنی ع وہ سمجھی کہا یہ پردہ پوشی نسخہ نظامی پریس میں ہے "وہ جا کے کہا"

بدیمن سمجھ کے گور کا نام — پنجرہ اک لائی وہ گل اندام

طوق اُسکو طلسم کا پنہایا — قمری اُسے سرو نے بنایا

دن بھر تو وہ فاختہ پڑھاتی — شب کو اُسے آدمی بناتی

غماز تھی ایک خواص اُسکی — دمساز تھی وقت خاص اُسکی

اک دن پنجرا اُڑا کے لائی — حسن آرا کو وہ گل سجھائی

کھولا جو وہ بند سحر بنیاد — دیکھا تو مجسم آدمی زاد

گستاخ جو اُس بشر کو پایا — غصہ غضب اُس پری کو آیا

لوگوں سے کہا ہٹاؤ اسکو — آتشکدے میں جلاؤ اسکو

لوگ اُسکو لے چلے جلانے — تقدیر کے سُنئے کارخانے

شہزادہ بکاؤلی کے ہمراہ — گزرا اُسی راستے سے ناگاہ

دیکھا تو وزیر زادہ بہرام — بوتے[۱] میں تھا نخل نقرۂ خام

جلنے سے پناہ دیکے اُسکو — فردوس میں آئے لیکے اُسکو

زندہ اُسے پا کے حسن آرا — بولی کہ یہ چور ہے ہمارا

قابل ہے جلانے کے یہ فاسق — روح افزا کا ہوا ہے عاشق

بولی وہ بکاؤلی کہ قربان — یہ کون سی فہم ہے مِری جان

پیارے[۲] کا جو اپنے ہو پیارا — کیونکر ستم اُس پہ ہو گوارا

حسن آرا نے کہا بجا ہے — تم کیوں نہ کہو کہ خود کیا ہے

---

۱ سونے چاندی کلابتون کی گتھیاں یا گھریا۔

۲ نسخہ نظامی پریس میں اس طرح ہے۔ لیکن معرکہ چکبست و شرر کے ساتھ جو نسخہ چھپا ہے اُس میں یہ مصرع اس طرح ہے ع پیارے کا جو اپنے ہووے پیارا۔

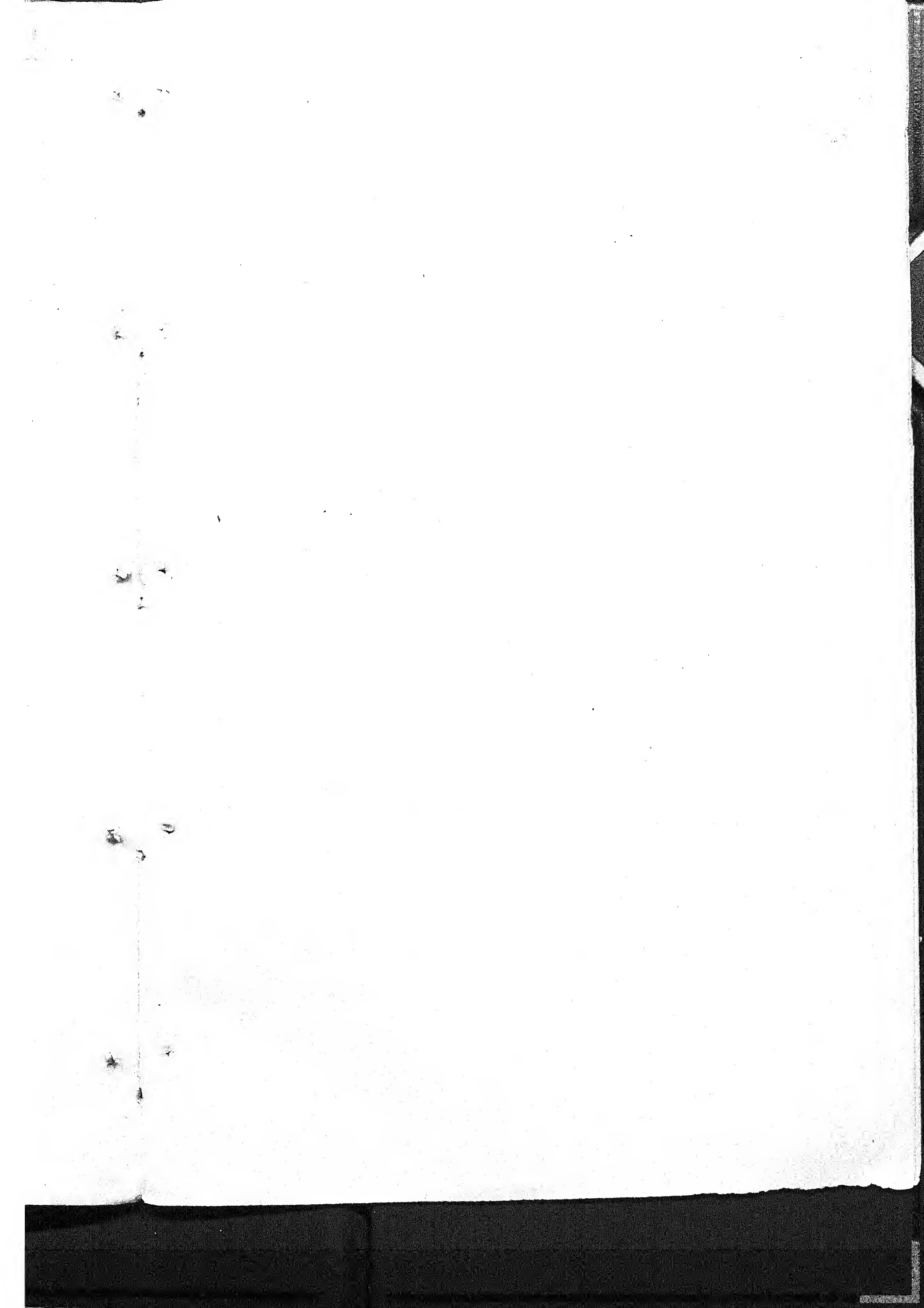
بولی وہ کہ پھر عبث ہے انکار　　جب عیب نہ تھا تو اب ہے کیا عار
کیا کہتی وہ دم بخود سُنا کی　　سوچی سمجھی رضا خدا کی
مرسوم تھے جس طرح کے انداز　　شادی کا خوشی خوشی کیا ساز

ایک شعر میں دونوں کے ملنے کا ذکر ہے

شادی جو ہوئی تو غم ہوا دور　　فردوس سے گھر کو آئی وہ حور
گلزار جواہریں میں آ کر　　آباد ہوئی وہ یاسمن بر
حاصل ہوئی اُن گلوں کو بیخار　　سیرِ شبِ زلف صبح رخسار
جس طرح انھیں بہم ملایا　　بچھڑے ہوئے سب ملیں خدایا

تاریخ اختتام تصنیف از مصنف

ایں نامہ کہ خامہ کرد بنیاد　　گلزار نسیم نام بنہاد
بشنید و نوید ہاتفے داد　　توقیع قبول روزیش باد



انتخاب دیوان نسیم

جب ہو چکی شراب تو میں مست مر گیا
شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا

نے قاصدِ خیال نہ پیکِ نظر گیا
اُن تک میں اپنی آپ ہی لیکر خبر گیا

روحِ رواں و جسم کی صورت میں کیا کہوں
جھونکا ہوا کا تھا ادھر آیا اُدھر گیا

سمجھا ہے حق کو اپنے ہی جانب ہر ایک شخص
یہ چاند اُسکے ساتھ چلا جو جدھر گیا

طوفانِ نوح اسمیں ہو یا شورِ حشر ہو
ہونا جو کچھ ہے ہوگا جو گذرا گذر گیا

شوریدگی سے میری یہانتک وہ تنگ تھے
روٹھا جو میں تو خیر منائی کہ شر گیا

میں نے بھی آنکھیں دیکھی ہیں پریوں کی جاؤ بھی
تم نے دکھائی آنکھ مجھے اور میں ڈر گیا

گذرا جہاں سے میں تو کہا اُسکے یار نے
قصہ گیا فساد گیا دردِ سر گیا

کاغذ سیاہ کرتے ہو کس کے لئے نسیم
آیا جواب خط تمھیں اور نامہ بر گیا

عشق میں دل بن کے دیوانہ چلا
آشنا سے ہو کے بیگانہ چلا

قلقلِ مینا سے آتی ہے صدا
بھر چکا جس وقت پیمانہ چلا

بے زبانوں کو بھی آئی ہے زباں
بیڑی غل کرتی ہے دیوانہ چلا

شب جو آیا بزم میں وہ شعلہ رو
شمع گُل کرنے کو پروانہ چلا

بوئے گُل غنچہ سے کہتی ہے نسیم
بات نکلی مُنہ سے افسانہ چلا

بتوں کو جو دیکھا گنہ کیا ہمارا　　خدائی خدا کی تماشا ہمارا
بتوں کی گلی چھوڑ کر کون جائے　　یہیں سے ہے کعبہ کو سجدہ ہمارا

پیری میں طرزِ عشق جوانی وہی رہا　　صورت کے ساتھ دل کا بدلنا محال تھا

چمن میں دھرکے آ کر میں کیا نہال ہوا　　برنگِ سبزۂ بیگانہ پائمال ہوا
کہانی کہہ کے سُلاتے تھے یار کو سواب　　فسانۂ عمر ہوئی خواب وہ خیال ہوا
جنوں کی چاک زنی نے اثر کیا واں بھی　　جو خط میں حال لکھا تھا وہ خط کا حال ہوا

صفتیں کیسی ہوئیں ذاتِ خدا سے پیدا　　راگ کیا کیا ہوئے ہیں ایک صدا سے پیدا
جوش میں آئے بہارِ چمنستاں یارب　　ابر ہو کف کی طرح موج ہوا سے پیدا

اشک ٹپکے حال دل کا کھل گیا　　دیدۂ گریاں سے پردہ کھل گیا
دل سے اُمڈے اشک خوں آنکھوں کی راہ　　جوشِ مے سے خُم کا ڈھکنا کھل گیا
کوچۂ جاناں کی ملتی تھی نہ راہ　　بند کیں آنکھیں تو رستا کھل گیا

بچھڑ کر غریباں نقشِ پا سے بچھڑ نہیں آگے　　یہیں تک ہر مسافر نے پتا پایا ہے منزل کا
[illegible] سے گردش ہو رہا ہے　　وہاں کشتی جو آتا ہے نظر [illegible] ساحل کا

جلد او ماہ تو گھر سے نکلا　　شکر ہے چاند کدھر سے نکلا
مثلِ بو رُخ نہ کیا سوئے چمن　　پھر نہ آیا میں جدھر سے نکلا
سیرِ گُل رویوں کی کرتا ہوگا　　ہے نسیم آج سحر سے نکلا

عشرت آبادِ چمن سے تجھے کیا تو تو نسیم　　نکہتِ گُل کی طرح ہوئے کو برباد آیا

بتخانہ کا پابند نہ کعبہ سے تعلق　　آزاد ہو قیدوں سے گرفتار تمہارا

شبِ فراق میں آنکھیں لگی ہیں جانبِ در　　لبوں پہ آہ ہے دل میں خیال آہٹ کا
عجیب محفلِ رنداں میں کل تھی کیفیت　　پیالہ بزم میں ناچا سبوئے مے مٹکا

وہ ماہ زلف کمر تک اگر چلا چلتا　　یقین ہے نہ عدم کا بھی راستہ چلتا
اگر نہ ہوتی مسلسل وہ زلفِ عمر دراز　　جنوں کے ناموروں کا نہ سلسلہ چلتا
جنوں میں گرچہ ہوں پیوند دامنِ صحرا　　برنگ چاک ہوں دل سے پھٹا پھٹا چلتا
خلافِ دیر و حرم حسن اتفاق سے ہے　　ہر اک کے ساتھ وہ ہر سو ہے چاند سا چلتا

روز بد سے ڈر کہ ہو جاتے ہیں پھر　　دوست دشمن [illegible] نا آشنا
دہر میں کمیاب کیا نایاب ہیں　　کیمیا۔ درویش۔ سچا آشنا
دل جلے کیا کیا نہیں کہتے تجھیں　　بے مروت۔ بے وفا۔ نا آشنا

ہے رنج عشق میرے لیئے ہیں برائے رنج — خود بھی مٹے یقیں ہے جو مجھکو مٹائے رنج
آئے اجل تو دونوں کی ہوجائے مخلصی — ہے رنج مبتلا مرا میں مبتلائے رنج
ہم شیشۂ شکستہ ہیں تم کیف موج مے — بنیاد عیش تم سے ہے ہم سے بنائے رنج
یا تنگئ کنار تھی یا اب فشار قبر — وہ ابتدائے عیش تھی یہ انتہائے رنج

قرص خور کو دیکھکر تسکین رکھ اے مہمان صبح — تا وہاں شام پہونچاتا ہے رازق نان صبح

اک عمر سے وظیفہ ہے صاحب کے نام کا — ناخن کے خط ہیں انگلیوں کے پور پور پر
کل تک جو شمع محفل عیش و نشاط تھے — جلتا نہیں چراغ بھی آج ان کی گور پر

چشم نم ہو تو امنڈ آتے ہیں دریا منہ پر — کھینچیے آہ تو آتا ہے کلیجہ منہ پر
خواب گونگے کا ہوا یار کا شکوہ گویا — دل میں بھرتا ہے مگر لا نہیں سکتا منہ پر
نیک و بد محو ہیں خاطر سے صفا مشرب کے — کب پڑا عکس سے آئینہ کے دھبا منہ پر

بل پڑنے لگا ابروئے خمدار کے اوپر — آجائے نہ آفت کہیں دو چار کے اوپر

صہبا کشوں کی خاک ہے ہر ایک مقام پر — ساقی لنڈھا شراب کو مستو کے نام پر

کالی گھٹا سی چھائی ہے وہ کھولے اُس نے بال — بجلی سی کوندتی ہے وہ بجلی مگر کمر

منزل سے دور رکھتا ہے خوابِ سحر نسیمؔ　　کھول آنکھ دیکھ باندھ چلے ہمسفر کمر

خواہ کعبہ خواہ بتخانہ کو جا　　دشت دل کا رہگذر ہے دو طرف
کفر و ایماں دونوں جانب کی سُنے　　اسلئے گوشِ بشر ہے دو طرف
باغ ہو یا دشت ہو قسمت نسیمؔ　　کوچ کی اپنے خبر ہے دو طرف

بے حجابی پہ وہ در پردہ جو آجاتے ہیں　　شرم رکھ لیتی ہے آنکھوں پہ نظر کا دامن

کیا کریں اصرار کچھ اسرار ہی کُھلتا نہیں　　سیکڑوں یاں سے گئے اور واں سے آئے سیکڑوں

قرار پر نہ ملو اضطراب ہو کہ نہ ہو　　شراب غیر کو دو دل کباب ہو کہ نہ ہو
گُلابی آنکھوں سے ساقی کے دل بچے کیونکر　　شرابیوں میں جو بیٹھے خراب ہو کہ نہ ہو

ملاتے نہیں آپ کیوں ہم سے آنکھیں　　قسم کھائی ہے کیا ادھر دیکھنے کو

قلقل سُنا کے چھیڑتے ہیں مے پرست کو　　شیشے سرود یاد دلاتے ہیں مست کو

ذلت ہے جو پھیلائے بشر پیش بشر ہاتھ　　یارب نہ کبھی ہاتھ کا ہو دست نگر ہاتھ
خورشید کے پنجے سے اشارہ ہے کہ عاقل　　اللہ کی جانب کو اُٹھا وقت سحر ہاتھ

خود چلا ہر قدم پہ کہتے نسیم ٹھہر تو نامہ بر کہونگا کچھ

... دلا کی کی نہ اصلا اٹھائے مرجائے نہ ناز مسیحا اُٹھائے
... لیا حسین چھنے ہوئے مٹی میں مل گئے افشاں سمجھ کے خاک سے ذرہ اٹھائے
اے جان دل جلا کے نہ لیجئے کسی کی آہ آنچ آتی ہے جو آگ سے شعلہ اٹھائے

ساغر بکف جہاں کوئی مست الست ہے بیضائے موسوی بھی وہاں داغ دست ہے
دیوانہ باش تا غم تو دیگراں خورند واللہ ہوشیار ہے وہ جو کہ مست ہے
اے مرغ دل تو شاخ نشیمن سے گر پڑا حیف آشیاں بلند ہے پرواز پست ہے
یا ہاتھ توڑے جائینگے یا کھو لینگے نقاب سلطان عشق کی یہی فتح و شکست ہے
شاگرد خواجہ آتش ہندی جو ہے نسیم کہتے ہیں پارسی کہ یہ آتش پرست ہے

کسی کے دل سے نہ یارب کوئی خراب گرے نہ شیشہ طاق سے نے شیشہ سے شراب گرے
کہوں جو اپنی میں افتاد بزم ساقی میں سبو سے بادہ گرے سیخ سے کباب گرے
جو دن کو نکلو تو خورشید گرد سر گھومے چلو جو شب کو تو قدموں پہ ماہتاب گرے
مراد پر ابھی آیا نہیں ہمارا کھیت اگر ہے برق کو ایسا ہی اضطراب گرے

خم نہ بنکر خود غرض ہو جائے مثل ساغر اور کے کام آئے
ابر رحمت سنتے ہیں نام آپ کا خاکساروں پر کرم فرمائے

آپ آہو چشم ہیں آہو نہیں　　ہم سے وحشت کی نہ لیجے آیئے
صبر رخصت ہو تو جانے دیجئے　　بیقراری آئے تو ٹھہرایئے
دل میں ہے دکھلائے تاثیر عشق　　ٹھنڈی سانسوں سے انھیں گرمایئے
سرد آہیں بھرتے ہیں جب ہم نسیم　　کہتے ہیں وہ ٹھنڈے ہے ٹھنڈے جایئے

جب نہ جیتے جی میرے کام آئیگی　　کیا یہ دنیا عاقبت بخشائیگی
جب ملے دو دل مخل پھر کون ہے　　بیٹھ جاؤ خود حیا اٹھ جائیگی
گر یہی ہے اس گلستاں کی ہوا　　شاخ گل اک روز جھونکا کھائیگی
داغ سودا ایک دن دیگا بہار　　فصل گل آکر شگوفہ لائیگی
کچھ تو ہوگا ہجر میں انجام کار　　بیقراری کچھ نہ کچھ ٹھہرائیگی
صندلی رنگوں سے مانا دل ملا　　دردسر کی کس کے ماتھے جائیگی
جاں نکل جائیگی تن سے اے نسیم　　گل کو بوئے گل ہوا بتلائیگی

اُف کروں دل کے جلن سے تو کلیجہ پھٹ جائے　　بلبلو کیسے ہزاروں کئے نالے تم نے

دل سے ہر دم ہمیں آواز بکا آتی ہے　　بند کانوں کو بھی گریہ کی صدا آتی ہے
گل ہوا کوئی چراغِ سحری اے بلبل　　ہاتھ ملتی ہوئی پتوں سے صبا آتی ہے
جسقدر وصل بتاں کا تمہیں رہتا ہے فراق　　اے نسیم اتنی کبھی یادِ خدا آتی ہے!

کیا ملا عرض مدعا کر کے　　بات بھی کھوئی التجا کر کے
لائے اُس بت کو التجا کر کے　　کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے
میں وہ بے آس ہوں کہ میرے پاس　　یاس آئی ہے آسرا کر کے

اب تو جاتے ہیں اُس گلی میں نسیم　　ہو رہے گا جو کچھ مقدر ہے

ہمتِ پیرِ مغاں دیکھ لے زاہد چل کر　　کوئی میخانہ سے پھرتا نہیں سائل خالی
عہدِ پیری میں روانہ ہوئے یوں ہوش و حواس　　صبح کو جیسے مسافر سے ہو منزل خالی

دوزخ و جنت ہے اب میری نظر کے سامنے　　گھر رقیبوں نے بنایا اُسکے گھر کے سامنے
عشق کے رتبہ کے آگے آسماں بھی پست ہے　　سر جھکایا ہے فرشتوں نے بشر کے سامنے
خاک دیکھا کچھ شبستانِ جہاں میں او نسیم　　ڈھیر پروانوں کا تھا شمعِ سحر کے سامنے

فراق دیدہ ہوں میں وصل یار باقی ہے　　خزاں رسیدہ چمن کی بہار باقی ہے
وہ فصل گل نہیں پر عندلیب کے دل میں　　گلوں کا داغ ہے گلچیں کا خار باقی ہے
ہوا تو کہتی ہے صاف آمدِ بہارِ چمن　　صدائے غنچہ و صوتِ ہزار باقی ہے
جنوں و عقل کے قصّہ سے چھوٹے بعد فنا　　نہ پردہ در ہے نہ وہ پردہ دار باقی ہے
غبارِ راہ ہوں پر خاکساری کہتی ہے　　ہوائے اوج و دماغ و وقار باقی ہے
ازل سے خاکیوں کے دل میں ہی حرارتِ عشق　　زمیں کی نبض میں اب تک بخار باقی ہے

نام پر حرف نہ آنے دیجے — جان اگر جائے تو جانے دیجے
یاس کی آس نہ ٹوٹے جس میں — اس کو یاس نہ آنے دیجے
غصہ کیا اب تو گیا یاں سے نسیمؔ — آیئے بیٹھئے جانے دیجے

ٹکڑے جگر کے آنکھ سے بارے نکل گئے — ارمان آج دل کے ہمارے نکل گئے

ساقی قدحِ شراب دیدے — مہتاب میں آفتاب دیدے
ساقی باقی جو کچھ ہووے ہے — باقی ساقی شراب دیدے
لیلی میں نے تجھے بنایا — مجنوں مجھکو خطاب دیدے
بیدار ہیں بختِ خفتۂ عشق — یارب آنکھوں کو خواب دیدے
پیاسا جاتا ہے نشترِ یار — او رگ کچھ خون ناب دیدے
اُس بت سے نسیمؔ زر نہ تو مانگ — جو چاہے وہ بیحساب دیدے

لگا جامِ شرابِ عشق جب مُنہ سے خرابی ہے — نشا آغاز ہوتا ہے خمار انجام ہوتا ہے۔

کیوں خفا رشک حور ہوتا ہے — آدمی سے قصور ہوتا ہے
مۓ الفت سے بھر گیا جو دل — صورتِ شیشہ چور ہوتا ہے
خاکِ عاشق سے جو درخت اُوگا — طور ہوتا ہے، نور ہوتا ہے
خاکساری وہ ہے کہ ذرّوں پر — روز بارانِ نور ہوتا ہے

غیر کا احوال سُنتے ہیں وہ خوب — اس لئے احوال میرا غیر ہے
ہے تری تیغِ نگہ میں کیا اثر — وار ہو ہم پر تو کتنا غیر ہے

اہل ہوس کا کس شے پہ بس ہے — اللہ بس ہے باقی ہوس ہے
سیرِ بیاباں چاکِ گریباں — وہ پایمردی، یہ دسترس ہے
ناحق بتوں نے بیداد کی ہے — اللہ میرے تو، داد رس ہے

جو چپ رہوں تو جنوں دل میں جوش کھاتا ہے — فغاں کروں تو گریباں گلا دباتا ہے
مکان سینہ کا پاتا ہوں دمبدم خالی — نظر بچا کے تو اے دل کدھر کو جاتا ہے

آن میں فرق نہ آنے دیجئے — جان اگر جائے تو جانے دیجئے

گُم ہوا سینے میں جب دل چشمِ گریاں کیا کرے — گھر میں جو کھویا اُسے خضرِ بیاباں کیا کرے
چشمِ گریاں کر سکے کیا آہ سوزاں کا علاج — آتشِ برقِ دماں کو آبِ باراں کیا کرے

پہنچی نہ راحت ہم سے کسی کو اور اذیت کوش ہوئے — جان پڑی تب بارِ شکم تھے مر کے وبالِ دوش ہوئے

زمانہ میں ہیں نکتہ داں کیسے کیسے — خط و خال کے ہیں بیاں کیسے کیسے
زباں زد ہیں وصفِ بتاں کیسے کیسے — دہن پر ہیں اُنکے گماں کیسے کیسے

کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

قضا جسدم آجاتی ہے بن کے دشمن　　کسی کی نہیں چلتی ہے مشفق من
اجل ہے گذرگاہ ہستی ہیں رہزن　　عجب کیا چھٹے روح سے جامۂ تن
لٹے راہ میں کارواں کیسے کیسے

نہ زخمی بدن ہے نہ گھائل ہوئے ہیں　　نہ خونی کفن ہے نہ بسمل ہوئے ہیں
ہوس کے کشتوں میں داخل ہوئے ہیں　　تمہارے شہیدوں میں شامل ہوئے ہیں
گل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے

جو دل سوز فرقت میں ہیں داغ سوزاں　　تو دمساز ہیں نالہ و آہ و افغاں
بنے رہتے ہیں روز ناخواندہ مہماں　　غم و غصہ و رنج و اندوہ حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

کوئی جانتا ہے کسی کو خبر ہے　　کہ پردہ میں کون اے صنم جلوہ گر ہے
کہیں کچھ خیال اور کہیں کچھ نظر ہے　　دل و دیدۂ اہل عالم میں گھر ہے
تمہارے لیئے ہیں مکاں کیسے کیسے

جو مے نوش ہیں رنگ اُنکے جمے ہیں　　پیئے پھول بدمستیاں کر رہے ہیں
گلابی کی ہاتھوں میں ساغر لیئے ہیں　　بہار آئی ہے نشہ میں جھومتے ہیں
مریدان پیر مغاں کیسے کیسے

کہاں تخت خسرو کہاں طاق کسرا　　محل اقامت کا اُن کے پتا کیا
ملے خاک میں سیکڑوں مسند آرا　　نہ گور سکندر نہ ہے قبر دارا
مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے

دلانہ کر غم سے اشکباری کہ یاس میں ہے امیدواری
جو یوں ہی ٹھہرے گی بیقراری تو ہو چکی زندگی ہماری
یہ خوبی اعمال کی ہے ساری کسی کو عزت کسی کو خواری
یہ رنج و زحمت ہے اعتباری نہ عیش و راحت ہو اختیاری
کبھی ہے دھوپ اور کبھی ہے سایہ گھڑی میں کچھ ہے گھڑی میں کچھ ہے
لگا کے دل اب جو ہے تفکر کہوں جو دل کی تو ہو تحیر
خموش بیٹھوں تو ہو تنفر کہ اسکو کچھ ہو گیا تجبر
یہاں تخلل وہاں تکبر وہاں تلون یہاں تغیر
کبھی تصور کبھی تحیر کبھی تکدر کبھی تحسر
نہ پوچھو ہمدم کہ حال میرا گھڑی میں کچھ ہے گھڑی میں کچھ ہے

آئی بہار زاہد ہشیار مست ہو — شیشہ کی فتح توبہ مے کی شکست ہو
دارم ز دین و کفر بہر یک قدم دو سیر — من میروم بہ کعبہ و دل میرود بدیر
تیرہ دل کے بزم میں جام شراب آتا نہیں — جانب ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہیں



غلط نامہ

پروف بالخصوص فٹ نوٹ کا پروف دیکھنے میں میں نے دوسروں پر اعتماد کیا۔ اسلئے بہت سی غلطیاں کتاب میں رہ گئیں۔ یہ اعتذار نہیں بلکہ خود اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔ امید ہے کہ ناظرین معاف فرمائیں گے اور اصل کتاب میں اسے درست فرمالیں گے۔ (مرتب)

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
		فہرست و مقدمہ	
کالم اول ۱	۱۴	لوازمہ	موازنہ
کالم دوم ۱	۱۰	صنایع	ضائع
۲	۱۸	ودیوکے	دیوکے
۴	۳	صنایع	ضائع
〃	۱۹	شورو بور	شور بور
۷	۱	تونے	تولے
۱۲	۵	شاعرپیشہ	شاعری پیشہ
〃	۱۱	مطلع	مقطع
۱۸	۱۵	پس پیش	پس و پیش
۲۹	۴	بادشاہ	بادشہ
〃	۱۶	لو	کو
۳۳	۱	کِتوں	کُتّوں
۳۷	۵و۷	ضایع	ضائع
۳۹	۱۹	یعنی ساسب لفظی	اور تناسب لفظی
۴۱	۷	نبایا گیا	نباہا گیا
۴۳	۷	خار	خوار
		گلزار نسیم	
۲	۱۱	مستقبل	مستقل
۵	۱۳	"چشم صفحا" تا "سمجھا جاتا"	چشم میں اور سر کے لحاظ سے یہ صنعت مرعات النظیر ہے۔
۷	۲	اک	ایک
۱۰	۱	پھٹی	جھپٹی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۲	۹	تپتا	پتا
۱۷	۱۶	جمشید	خسرو
۱۹	۱۵	مٹھی بند کرکے	بغل سے نکال کر
۲۴	۱۴	مژہ کی	مژہ کے
۲۷	۱۷	کوئی نہایت	کسی نہایت
۴۰	۱۰	صحبت	صُحبت
۴۵	۱۲	مری	میری
〃	۱۶	یم ہیں	یم میں
۴۹	۸	اک شب کی تھی	اک شب کر تھی
۵۲	۱۹	تجنیس	ایہام تناسب
۵۹	۷	بادشاہ	بادشہ
۶۰	۱۸	بازہ راستے پیدا ہوگئے تھے	راستہ پیدا ہوگیا تھا
۶۶	۱	مُشاطہ	مَشّاطہ
۶۹	۷	مہدی	مہندی
۷۰	۱۳	خانوں	خوانوں
۷۷	۱۶	کرنے	×
〃	۱۸	"کی تجنیس" تا "ہوگیا ہے"	کے لحاظ سے صنعت ایہام تناسب ہے
۸۵	۶	ششد	ششدر
۸۶	۱۰	آنسوں	آنسو
۸۸	۱۸	زود	زور
۹۰	۳	قہر	قہرو
〃	۴	قند	قید
۹۸	۸	کرو	کروہ

مشاهیر کی رائیں

عالیجناب ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو ال ال - ڈی

مخدومی مولانا اصغر حسین صاحب - تسلیم

چالیس سال کے بعد مثنوی گلزار نسیم کا میں نے پھر مطالعہ کیا اور میں آپکو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپنے اس بے مثل مثنوی کو اس خوبی کے ساتھہ مرتّب فرماکر اُس کا لطف دوبالا کردیا - آپنے جو نوٹ تحریر فرمائے ہیں وہ نہایت مناسب و مفید ہیں - مگر نوٹوں سے بڑھکر آپ کا مقدمہ ہے جسکو میں نے نہایت مسرّت کے ساتھہ پڑھا -

آپ نے نہایت منصف مزاجی سے کام لیا ہے اور میرے خیال میں آپ کی یہہ رائے کہ "گلزار نسیم" نہ صرف اپنے رنگ کی پہلی مثنوی ہے بلکہ اِسے لکھنؤ اور لکھنؤ اسکول کی پہلی مثنوی بھی کہنا بیجا نہ ہوگا" بالکل صحیح ہے -

میری رائے ناقص میں آپنے اُردو کی نہایت اعلیٰ درجہ کی خدمت کی ہے ' جسکی مجھے اُمید ہے کہ ہر علم دوست شخص کی نگاہ میں قدر ہوگی -

فقط

بندہ

تیج بہادر سپرو

عالیجناب آنریبل جسٹس ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان ' نائٹ '
ایل ایل - ڈي - جج عدالت عالیہ ' الہ آباد -

'یادگار نسیم ' جو مولوي اصغر صاحب نے تصحیح کے بعد شایع کي ھے ' مشہور و معروف شاعر نسیم کي مثنوي ھے ' جسے اُنھوں نے مصلحتاً نامناسب اشعار کو حذف کر کے شایع کیا ھے - غزلیات میں سے جن غزلوں کا انتخاب کیا ھے ' وہ شاعر موصوف کي بہترین غزلیں ھیں.........طلبا کے فائدے کے لئے مفید حواشي کا بھي اضافہ کیا گیا ھے.........اس کتاب کا مقدمہ بجائے خود ایک عالمانہ تصنیف ھے.........اور اس میں کسي کو بھي شك نہیں ھوسکتا کہ یہہ بحیثیت شاعر کے نسیم کي ایک بے مثل و جدید تصویر اور اُس کے شعر کي منصفانہ اور پر مغز تنقید ھے...... مجھے کامل یقین ھے کہ اس کتاب کا استقبال اُسي شان سے ھوگا جو اس کے شایاں ھے -

---

عالیجناب ڈاکٹر خواجہ غلام السیّدین صاحب ' پي ایچ - ڈي - پرنسپل ٹریننگ کالج ' علیگڈھہ -

ادیب شہیر اصغرحسین صاحب ' اصغر نے ' یادگار نسیم ' کو مع ایک مبسوط مقدمہ اور حواشي کے مرتّب کیا ھے اور اِنڈین پریس ' الہ آباد ' نے اس کو اِنتہائي خوش مذاقي اور عمدگي سے

چھاپ کر شایع کیا ھے - میں نے مثنوی کو جستہ جستہ اور اُسکے دلچسپ اور نکتہ رس مقدمہ کو بتفصیل پڑھا - اس کتاب کو ترتیب دیکر اصغر صاحب نے اُردو ادب کی بہت بڑی خدمت اور ادب کے قدردانوں پر احسان کیا ھے - اس میں سے ایسے اشعار حذف کردئے گئے ھیں جو طلبا کے لئے غیر موزوں ھوتے - اسلئے اب یہہ مثنوی اس قابل ھے کہ فاضل مرتّب کے مقدمہ کے ساتھہ ساتھہ کالج کے طلبا کے درس میں شامل ھو' تاکہ وہ ادب کی اس خاص صنف سے بہ اسلوب مناسب روشناس ھوسکیں -

اصغر صاحب کا مقدمہ بجائے خود ایک بہت قابل قدر کارنامہ ھے - اِن میں جہاں ایک طرف یہہ صلاحیت مذاق ھے کہ وہ شاعری کی لفظی خوبیوں اور انداز بیان کی لطافتوں کو سراھتے ھیں اور اُس کے کھوتے کھرے کو نہایت سلیم معیار پر پرکھتے ھیں وھاں وہ شاعری اور تمدن کے گہرے تعلق سے باخبر ھیں' اور فرد اور جماعت کی شخصیت کی باھمی اثر پذیری کو بھی خوب سمجھتے ھیں - حسن مذاق اور قوّت فکر کے اس اجتماع نے اُن کو ایک نہایت کامیاب نقّاد بنا دیا ھے اور اُنھوں نے اپنے فرض تنقید کو بغیر مبالغہ اور بیجا ستائش کے لیکن جوش اور خلوص کے ساتھہ پورا کیا ھے -

فقط

خواجہ غلام السّیدین

عالیجناب پروفیسر ڈاکٹر تارا چند، ڈي فل، ایم - اے -
جنرل سکریٹري هندوستاني اکاڈیمي، ممالک متحدہ -

مولوي اصغر حسین صاحب گونڈوی اُردو نثر و نظم کے ایک مشہور و معروف مصنف هیں - آپنے شاعر نسیم کے متعلق ایک کتاب شایع کي هے، جس میں نسیم کي شہرۂ آفاق مثنوي اور اُس کے دیگر اشعار کا انتخاب شامل هے -

' یادگار نسیم ' کے مقدمہ میں نسیم کے زمانے اور اُسکي حیات سے بحث اور اُس کے شعر پر تنقید کیگئی هے - یہہ بڑي قدر و قیمت کی ایک عالمانہ تحریر هے اس میں زمانۂ جدید کي اُس عقلیت کي روح بهي موجود هے جو اُردو زبان کي ادبیات کي ترقی کے لئے نہایت ضروري هے - اس پر مغز اور خوش اسلوب تحریر کا مطالعہ باعث صد مسرت هے، اور مجهے اسمیں مطلق شبہ نہیں هے کہ یہ کتاب اُردو ادبیات کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے شوق افزا ثابت هوگي -

---

عالیجناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب، پي ایچ - ڈي -
پرنسپل جامعہ ملّیہ، دهلي -

مورخہ ۲۵ - اگست ۱۹۳۰ع

(یادگار نسیم)

اُردو زبان میں تنقید کا فن ابهي ابتدائي منازل میں هے - لیکن 'یادگار نسیم' (مطبوعہ انڈین پریس' الہ آباد) میں اصغر حسین صاحب اصغر نے جو مقدمہ ' مثنوي گلزار نسیم' پر سپرد قلم

فرمایا ہے وہ کسی زبان میں ہوتا ، ناقدانہ تحریروں میں ایک بلند مرتبہ کا مستحق قرار دیا جاسکتا تھا - اس تنقید میں حُسن شعر کا وہ لطیف ادراک بھی موجود ہے جو کسی اچھے شاعر ہی میں آسانی سے ممکن ہے اور وہ دقّت نظر بھی جو فلسفی کی خصوصیت ہے - شاعری پر اجتماعی ذہنیت کے اثرات کو اور پھر اس اجتماعی ذہنیت کے غلبہ و تسلط کے باوجود شاعر کی مخصوص انفرادی شخصیت کے ظاہر ہوجانے کو جس خوبی سے دیا شنکر نسیمؔ کی مثنوی کی مثال سے واضح کیا گیا ہے وہ حضرت اصغرؔ ہی کا حصہ ہے -

انڈین پریس الہ آباد نے واقعی اُردو زبان کی بڑی خدمت کی ہے ، کہ اس مشہور مثنوی کا یہہ دیدہ زیب اور صحیح اڈیشن شایع کیا اور اسپر حضرت اصغر کے عالمانہ مقدمہ اور مفید حواشی سے اُسکی قیمت کو بہت بڑھا دیا -

ذاکر حسین

عالیجناب پروفیسر مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری
مدیر رسالہ 'جامعہ' جامعہ ملّیہ - قرول باغ ، دہلی -

اُردو زبان کی مشہور مثنوی 'گلزار نسیم' پر مولانا اصغر حسین صاحب اصغرؔ کا مقدمہ میں نے دلچسپی اور توجہہ سے پڑھا - یہ مثنوی اپنی جن خصوصیات میں ممتاز ہے مولانائے موصوف نے اُنکو ایک ایک کرکے عالمانہ نکتہ رسی اور ناقدانہ بصیرت کے ساتھہ نمایاں کیا ہے - اور جو کچھہ لکھا ہے دیدہ وری اور انصاف کے ساتھہ لکھا ہے -

انھوں نے لکھنؤ کے اُس عہد کی اجتماعی شاعرانہ کیفیت اور نسیم کی انفرادی ذہنیت کو جس خوبی کے ساتھہ سمجھا اور سمجھایا ھے اُس سے اُنکے پورے آشنائے فن ھونے کا ثبوت ملتا ھے - حقیقت یہہ ھے کہ اُنھوں نے یہہ مقدمہ لکھکر 'مثنوی گلزار نسیم' کا وہ حق' جو مدتوں سے اُردو اھل قلم کے ذمہ فرض تھا ' ادا کر دیا -

محمد اسلم جیراجپوری

'یادگار نسیم'

عالیجناب مولنا حافظ سید شاہ محمد علی احسن صاحب احسن مارھروی ' لکچرار مسلم یونیورسٹی ' علیگڈھہ -

اُردو کی بعض کتابیں ' مضامین کی دلچسپیوں کے اعتبار سے ' اتنی مشہور و معروف ھو گئی ھیں کہ ھرکس و ناکس اُن کے نام جانتا ھے ' لیکن اُن کتابوں کے مضامین کو شاعرانہ صنائع و بدایع اور تشبیہات و استعارات کے الجھیڑوں نے اس قدر پیچیدہ کر دیا ھے کے عام افہام و ادراک کے لئے ان گھاتیوں کی بھول بھلیاں شاھراہ حقیقت سے بھٹکادینے کا سامان پیدا کر دیتی ھیں - انھیں کتابوں میں پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی بھی ھے - پچھانوے برس سے یہ مقبول اور مطبوع مثنوی اپنی تمام دلچسپیوں کے ساتھہ تمغاے مقبولیت حاصل کئے ھوئے ھے ' بہت سے اشعار محاورہ و مثل کی طرح اُردو کے روز مرہ میں داخل ھوچکے

هیں - مگر اب تک دو ایک ناقدانہ محاکمہ وتبصرہ کے سوا کسي نے اس مثنوي کو اس حسن نظر سے شرف مطالعہ نہیں بخشا جسکي بدولت یہہ کارنامہ اُس طبقے کے لئے کار آمد ثابت هوتا جس کو آئندہ علمي سرمایہ داروں کا نمایندہ بننا هے یعني طالبان علم !

یہ سہرا مولانا اصغر حسین صاحب اصغرؔ (مصنف ' نشاط روح ') کے سر رها جنهوں نے بغایت غور و تامل اور نہایت جامعیت و قابلیت کے ساتھہ مثنوي کے ان پہلوؤں کو نمایاں کیا هے جو ابتک بساط غفلت میں لپٹے هوئے تھے - کسي زبان کو علمي زبان بنانے کي اس سے بہتر اور مفید کیا تدبیر هوسکتي هے کہ اس کي تصانیف علمي ادارات میں پھیلائي جائیں - اب تک یہہ مثنوي ارباب نشاط کا آلہ تفریح بني هوئي تھي مگر اب مولانا اصغر نے اصحاب علم کے انبساط کا سامان فراهم کر دیا هے -

اس مثنوي پر جو مقدمہ لکھا گیا هے وہ بجاے خود ایک ذخیرہ معلومات اور درس افادات هے - جس دقّت نظر سے اجتماعي و انفرادي ذهنیت پر بحث کیگئي هے في الحقیقت وہ مولانا اصغر هي کا غیر مشترکہ حصہ هے - یہہ نہ سمجھنا چاهئے کہ اس مقدمہ میں صرف نسیمؔ کي مدح خواني پر اکتفا کیگئي هے بلکہ واقعي اور حقیقي انساني کمزوریوں اور اخلاقي پابندیوں کا تذکرہ کرتے هوئے وہ نقوش بھي اُبھار کر دکھائے گئے هیں جنکي بدنمائي ' مثنوي کے اصلي محاسن کو متأثر هوئے هے - چونکہ یہہ مثنوي طالب علموں کیلئے مرتب کیگئي هے اسلئے ایسے اشعار ' جو آجکل کے معیار تہذیب سے گرے هوے هیں ' حذف کر دئے گئے هیں -



راقم آثم
احسن مارهروي

